دفاعِ سیرتِ طیبہ

یعنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس شخصیت اور پاکیزہ زندگی کے تعلق سے
مستشرقین ومعاندین کی غلط بیانی ودروغ گوئی کا علمی جائزہ
اور سیرتِ طیبہ کی پاکیزگی وتقدس کے شواہد ودلائل

تالیف
مفتی محمد اشرف عباس قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند

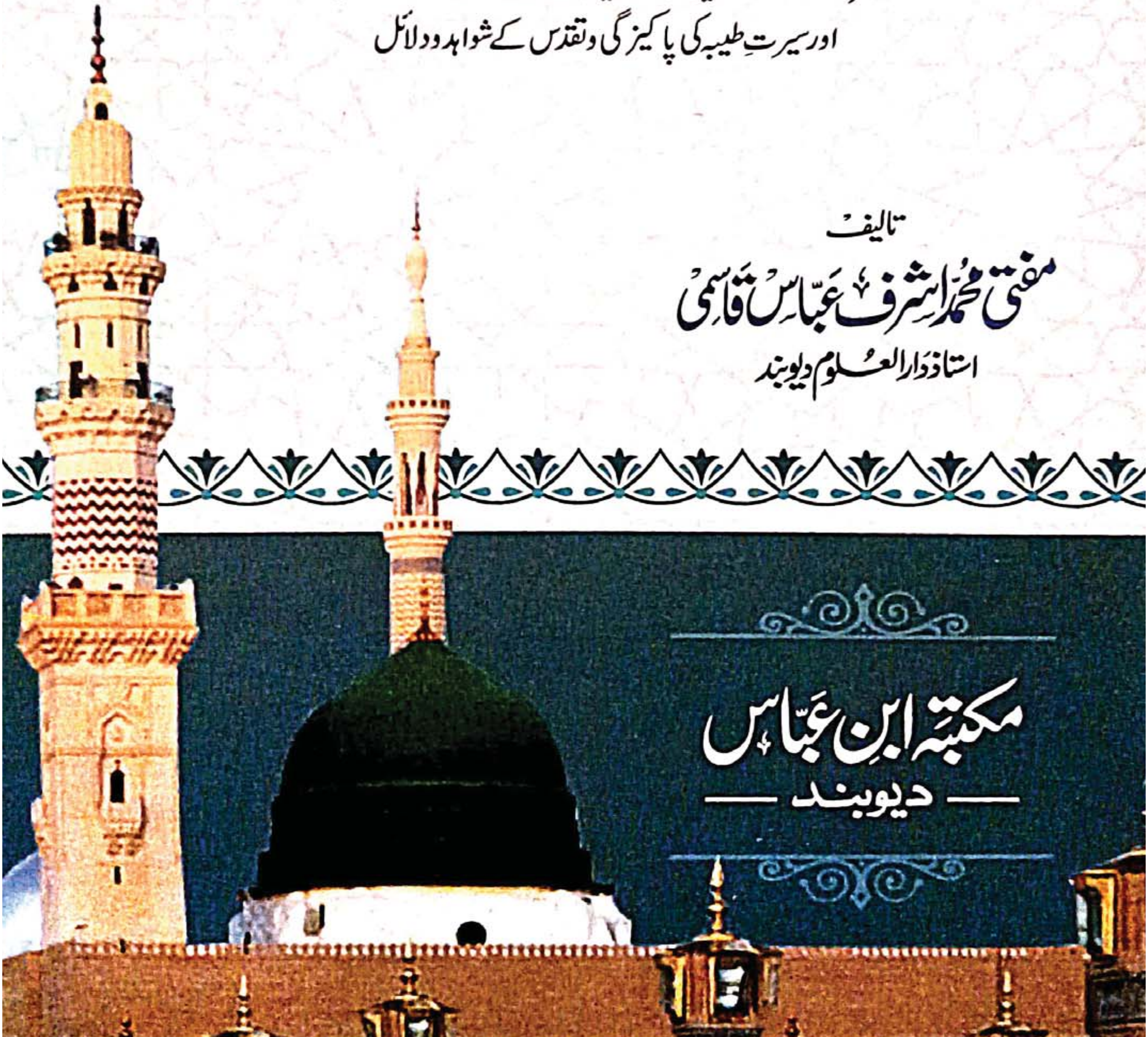

مکتبہ ابن عباس
دیوبند

دفاعِ سیرتِ طیبہ

یعنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت اور پاکیزہ زندگی کے تعلق سے
مستشرقین ومعاندین کی غلط بیانی ودروغ گوئی کا علمی جائزہ
اور سیرتِ طیبہ کی پاکیزگی وتقدس کے شواہد ودلائل

تالیف
مفتی محمد اشرف عباس قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ناشر
مکتبہ ابن عباس
دیوبند

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تفصیلات

نام کتاب : دفاعِ سیرتِ طیبہ/دلائلِ تقدّس

تالیف : مفتی محمد اشرف عباس قاسمی (استاذ دارالعلوم دیوبند)
+91 8126559700
+91 9835675969

اشاعت اوّل : رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ، اپریل ۲۰۲۴ء

تعداد : گیارہ سو

ناشر : مکتبہ ابن عباس دیوبند

تقسیم کنندہ : دارالعلوم شکری، ضلع مدھوبنی (بہار)
+91 8084169988

دیوبند وسہارنپور کے معروف کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

فہرست

عنــــــاوین **صفحہ**

حرفِ آغاز ۹
تقریظ: حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی ۱۲
تبریک: حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی ۱۴
تقدیم: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۱۵
رخِ روشن کو داغ دار کرنے کی کوششیں ۲۰
اسلام مخالف چار محاذ اور ان کا حال ۲۰
تحریک استشراق کا پس منظر ۲۱
استشراق اور مستشرق ۲۳
مستشرق کا حقیقی مفہوم ۲۳
مستشرقین کے اہداف وعزائم ۲۴
حیاتِ طیبہ پر افتراءات ۲۵
رسول مطہر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسب ونسب پر طعن ۲۶
انبیاء علیہم السلام عالی نسب ہوتے ہیں ۲۶
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی شرافت ۲۷
مستشرقین کا نسب پر دو اعتبار سے طعن ۲۷
اَ- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سیدنا اسماعیلؑ سے تعلق ۲۸
افتراء کا ردّ ۲۸
ب- اولاد اسماعیل سے شرافت وفضیلت کی نفی ۳۰
افتراء کا ردّ ۳۰
کیا حضرت ہاجرہ ام اسماعیل باندی تھیں؟ ۳۱

بخاری شریف میں حضرت ہاجرہ کا تذکرہ	۳۳
مستشرق مؤرخ گبن کی شہادت	۳۴
وحی ربانی کا انکار اور اس کی غلط تشریح	۳۶
وحی کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	۳۶
نزولِ وحی کی صورتیں	۳۷
وحی قلبی	۳۷
وحی کلامی	۳۸
وحی مَلَکی	۳۸
وحی کی مصدریت اور مستشرقین کے مغالطے	۴۰
نفسیاتی مرض اور مرگی کا اثر	۴۰
مرگی کی حقیقت	۴۲
مرگی کے الزام کا رد	۴۲
وحی اور مرگی کی کیفیات میں فرق	۴۴
بعض مستشرقین کا اعتراف حقیقت	۴۶
قرآن مجید کے تورات و انجیل سے ماخوذ ہونے کا مغالطہ	۴۷
مغالطے کی تردید: قرآن و کتب سابقہ کی تعلیمات کا موازنہ	۴۸
تردید:۲	۵۱
تردید:۳	۵۱
تردید:۴	۵۲
تردید:۵	۵۲
تردید:۶	۵۳
تردید:۷	۵۳
بحیرا اور ورقہ کی شاگردی کا فسانہ	۵۳
بحیرا سے شاگردی کی نسبت غلط ہونے کی دلیل	۵۴

دلیل:۲	۵۴
دلیل:۳	۵۴
ورقہ بن نوفل کبھی آپ کے معلم نہیں رہے	۵۴
بعض مستشرقین کا اعتراف حقیقت	۵۵
اسلام کی اشاعت میں تلوار اور طاقت کے بے جا استعمال کا طعن	۵۶
الزام کا پس منظر	۵۷
مستشرقین اور ہندو مؤرخین کی افترا پردازی اور اس کی حقیقت	۵۸
نبئ رحمت پر دہشت کا طعن	۵۹
اشاعت اسلام میں تلوار کا کردار	۶۰
کتاب وسنت کی کسوٹی پر	۶۰
عقل کی کسوٹی پر	۶۲
تاریخ کی کسوٹی پر	۶۳
اسلامی جہاد اور دیگر جنگوں میں فرق	۶۵
طریقۂ کار کے اعتبار سے فرق	۶۷
مقاصد اور انجام کے اعتبار سے فرق	۶۹
اشاعت اسلام میں اخلاق وکردار کا اثر	۷۱
اشاعت اسلام کے ذرائع	۷۴
دعوت	۷۴
ہجرت	۷۶
مصالحت	۷۷
مکاتبت	۷۹
بعض مخالفین کا اعتراف حقیقت	۸۰
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد نکاح اور مستشرقین کے بے جا اعتراضات	۸۲

مستشرقین کے گستاخانہ تبصرے	۸۲
اسلام اور تعدد ازواج	۸۳
تعدد ازواج کی شرائط و قیود	۸۴
فحاشی اور بے راہ روی کا جائز متبادل	۸۵
متعدد نکاح کے جواز کے اسباب اور حکمتیں	۸٦
ا-عورت کی حفاظت اور اس کے وقار کا خیال	۸٦
۲-حالت مرض میں نگہداشت	۸٦
۳-حصول اولاد کی خواہش کی تکمیل	۸۷
۴-عورتوں کا تعاون	۸۷
۵-مرد و عورت میں فطری تفاوت کی رعایت	۸۷
٦-مرد کی جنسی طاقت کی رعایت	۸۷
۷-کوئی محروم نہ رہے	۸۸
۸-رشتہ داری اور ارتباط کے دائرے کی وسعت	۸۸
غور و فکر کا ایک اہم پہلو	۸۹
اسلام نے تعدد ازواج کے تصور کی اصلاح کی ہے	۸۹
مغرب کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کا امتیاز	۹۰
تعدد زوجات کے تعلق سے معاصر دنیا کا رویہ	۹۱
مرد کی طرح عورت کو چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں؟	۹۲
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاح	۹۳
چار سے زیادہ کی اجازت	۹۳
(ا) وحی اور شریعت کے عین مطابق عمل	۹۴
(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت	۹۴
(۳) اللہ کی اجازت اور ازواج کی مرضی سے سارے نکاح ہوئے	۹۴
متعدد نکاح کے اسباب اور مصلحتیں	۹٦

مشترکہ عمومی مفادات ومصالح	۹۶
خواتین کے سرپر تاج عظمت	۹۸
خاص خاص نکاح سے وابستہ عمومی مصلحتیں اور مفادات	۹۹
۱-تالیف قلب اور اسلام مخالف جذبات کا خاتمہ	۹۹
۲-تشریعی حکمتیں	۱۰۰
۳-بعض خاص صحابہ کا اعزاز واکرام	۱۰۱
۴-قبیلے پر نوازشات اور مخالفین کی حیثیت عرفی کا لحاظ	۱۰۱
۵-اشک شوئی ودل جوئی	۱۰۳
نکاحوں کا محرک خواہش نفس یا شہوت پرستی ہرگز نہیں	۱۰۳
دیگر مذاہب کی مقدس شخصیات کے یہاں تعدد ازواج	۱۰۵
چار سے زائد ازواج کو نکاح میں کرنے	۱۰۶
اور طلاق نہ دینے کی ایک اہم سماجی وشرعی مصلحت	
بعض مغربی مصنفین کا اعتراف حقیقت	۱۰۷
حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح	۱۰۹
مستشرقین کی ہرزہ سرائی	۱۱۰
گفتگو کے چار نکات اور مستشرقین کا ماخذ	۱۱۱
ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا	۱۱۲
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ	۱۱۳
۱-روایات کا مختصر جائزہ	۱۱۴
روایات کے سلسلے میں ابن کثیرؒ کی رائے	۱۱۸
حافظ ابن حجرؒ کا تبصرہ	۱۱۸
۲-روایات صحیحہ سے مخالفین کے دعوے کا بطلان	۱۱۹
۳-سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۷ کی صحیح تفسیر	۱۲۲
صحیح اور مختصر تفسیر	۱۲۲

امام بغویؒ اور قرطبیؒ کی رائے ۱۲۶
دلائل عقلیہ سے الزامات کی تردید ۱۲۸
بعض مستشرقین کا اعتراف حقیقت ۱۳۱

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح

۱۳۴
تعارف ۱۳۴
علم وفضل اور حدیث وفقہ میں امتیاز ۱۳۵
زہد وعبادت ۱۳۶
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت میں ۱۳۶
بہ وقت نکاح اور رخصتی حضرت عائشہ کی عمر ۱۳۸
مستشرقین کا اعتراض ۱۴۰
نکاح بہ امر الٰہی تھا ۱۴۰
اس عمر میں نکاح کا رواج تھا ۱۴۰
عرب معاشرے میں آج بھی یہ قابل قبول ہے ۱۴۲
گرم آب وہوا ۱۴۳
حضرت عائشہ کا تاثر ۱۴۴
علم کی اشاعت ۱۴۵
کم سنی میں نکاح مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں ۱۴۷
یورپی معاشرے میں کم سنی کے نکاح کا تصور ۱۴۸
خلاصۂ کلام ۱۴۹

حرفِ آغاز

الحمدلله رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین
محمد وآلہ وصحبہ أجمعین. أما بعد!

روزِ اوّل ہی سے پیغمبرِ اسلام محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف طاغوتی طاقتوں اور ائمہ کفر وضلال کی جانب سے الزامات واتہامات کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے، گوکہ وہ اپنی تمام تر منصوبہ بندیوں اور معاندانہ سازشوں کے تانے بانے بُننے کے باوجود خائب وخاسر رہے اور بعد والوں کے لیے نمونۂ عبرت بن گئے، تاہم ناخلفوں نے اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے بوجہل وبولہب کی ہی روش کو باقی رکھا اور نئے وسائل واسلحہ سے لیس ہو کر چراغِ مصطفوی کو پھونکوں سے بجھانے کی کوششیں کیں، اگرچہ داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منفی پروپیگنڈے سے ان معاندین کو اپنے مذموم مقاصد میں مطلوبہ کامیابی کبھی نہ مل سکی، وہ اپنی دل آزار خانہ ساز نام نہاد تحقیقات اور پروپیگنڈے سے رسولِ عربی سے نسبت رکھنے والوں کے جذبۂ عشق کو کبھی فرو نہیں کر سکے بلکہ ان تحریروں کے نتیجے میں تلاشِ حق کے جذبے نے بہت سے بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم پہنچا دیا۔ اس وقت مغرب اور یورپ سمیت دنیا کے بڑے حصے میں اسلاموفوبیا کی مہم، قرآن اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی برگزیدہ شخصیت کے خلاف جارحیت عروج پر ہے، تاہم مضطرب روحوں کا ظلمت سے روشنی کی طرف سفر کا سلسلہ جاری ہے، عصرِ حاضر میں اسلام کے خلاف تہذیبی یلغار میں جو شدت آئی ہوئی ہے اس سے بھی مستقبل قریب میں صنم خانوں سے کعبے کو پاسباں ملنے کے بھرپور امکانات ہیں۔ تاہم ہر دور میں اہلِ علم کی ایک جماعت نے دل

آزار اعتراضات کا بھی معروضی جائزہ لیا اور صحیح صورت حال واضح کی تا کہ اہل حق کے ایمان ویقین میں مزید اضافہ ہو، اور جن لوگوں کے افکار وخیالات ان اتہامات سے متاثر ہوئے ہیں ان کا تزکیہ ہو سکے۔ زیر نظر کتاب ''دلائل تقدس'' یا ''دفاعِ سیرت طیبہ'' بھی اسی سلسلے کی ایک حقیر کوشش ہے۔

ابتدائی محرک یہ ہوا کہ مخدوم گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حفظہ اللہ نے سیرت کے پیغام کو عام کرنے اور دیگر ابناء وطن کے ذہنوں کی تطہیر کے لیے حیدرآباد میں 21 تا 23 فروری 2016ء ایک بین الاقوامی سہ روزہ سیرت نبوی ﷺ کانفرنس منعقد کی، اس موقع پر حضرت مولانا کے حکم پر مجھ ناچیز کو بھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہ وقت نکاح عمر کے حوالے سے ایک مختصر تحریر مرتب کر کے پیش کرنے کا موقع ملا، مقالے کی تحریر کے دوران شدت سے احساس ہوا کہ سیرتِ طیبہ کے دوسرے پہلوؤں پر بھی مخالفین نے جو ہرزہ سرائی کر رکھی ہے ان کا جائزہ لے کر خاص ترتیب پر شکوک وشبہات اور غلط دعایات وافتراءات کی ظلمتوں کو ختم کر کے حق وصداقت کی روشنی کو عام کیا جائے، اس طرح موضوع سے متعلق مضامین جمع ہوتے رہے، اور ام المدارس دارالعلوم دیوبند کے موقر ماہنامے ''دارالعلوم'' کے صفحات پر مدیر گرامی قدر حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری حفظہ اللہ ورعاہ کی خصوصی توجہ سے ان کی اشاعت ہوتی رہی، چنانچہ نومبر 2020ء سے اگست 2022ء تک کے مختلف شماروں میں دس قسطیں منظر عام پر آگئیں۔ ان کج مج تحریروں کو بعض قابل احترام شخصیات اور ماہنامے کے قاریوں نے بہ نظر استحسان دیکھا اور ان کی مستقل اشاعت کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرح بحمد اللہ یہ رسالہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔

اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ بندہ دل کی گہرائیوں سے محترم ومکرم حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی، مخدوم گرامی حضرت الاستاذ مولانا سید ارشد مدنی اور فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں تشکر وامتنان کے کلمات پیش کرتا ہے کہ ان اکابر ملت نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود ازراہِ

عنایت کتاب کے مسودے پر نظر ڈالی اور اپنے گراں قدر کلمات سے نواز کر کتاب کو اعتبار واستناد عطا فرمایا۔ جزاهم الله تعالى أحسن الجزاء

اس رسالے میں خصوصیت کے ساتھ رسول مطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر معاندین و مستشرقین اور نام نہاد مؤرخین نے مختلف پہلوؤں سے جو چھینٹا کشی کر کے حق کا گلا گھونٹنے کی مذموم حرکت کی ہے، اس کا جائزہ لے کر علم و تحقیق کو راہنما بناتے ہوئے حقیقت حال آشکارا کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنی اس کوشش میں کس قدر کام یاب ہوں، تاہم یہ ضرور ہے کہ ناموسِ رسالت کے دفاع میں یہ ادنیٰ کاوش بھی میرے لیے متاع حیات اور سرمایۂ آخرت ہے، کیا عجب کہ یہی بضاعت مزجات مجھ گنہ گار کے لیے ذریعۂ نجات اور کامیابی کا باب ثابت ہو، اور ان کی نگاہ الطاف کو اپنی طرف منعطف کر سکے، جن کی شفاعت کے امیدواروں میں ان کا یہ ادنیٰ غلام بھی شامل ہے۔ صلی الله عليه وسلم تسليما كثيرا، والحمد لله أولًا وآخرًا

اشرف عباس قاسمی

۱۱ر محرم ۱۴۴۵ھ

تقریظ

امیر الہند حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم

صدر المدرسین دار العلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہر دور میں حق کے خلاف باطل کی طرف سے یلغار کا سلسلہ جاری رہا ہے، اسلام و اسلامی نظام، قرآن وقرآنی تعلیمات، شخصیات اور ان کے لیل ونہار ہر ایک پر باطل نے جارحانہ وار کیا ہے، ان میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو کچھ زیادہ ہی نشانہ بنایا گیا۔ نیز یہ کوئی نئی واردات نہیں، بلکہ دشمنانِ اسلام کی پرانی روایت رہی ہے جو ہنوز جاری ہے۔ ان سب کے پس پردہ معاندین اسلام کا مقصد اسلامی طاقت کو کمزور کرنا اور اسلامی تعلیمات میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے جس کے لیے سب سے کارگر حربہ یہ اختیار کیا گیا کہ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ستودہ صفات کو مجروح کر دیا جائے تاکہ حامیانِ اسلام کے دل و جان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نکل جائے، اس طرح خشتِ اوّل ہی متزلزل ہو جائے؛ چناں چہ اس کام کو انجام دینے کے لیے یورپی مؤرخین کا ایک دانش مند ٹولہ مستشرقین کے نام سے سرگرم عمل رہا ہے اور ہے، لیکن یہ بھی یقین نہیں یقین کامل ہے کہ رہتی دنیا تک رسول عربی سے نسبت رکھنے والوں کے دلوں سے جذبۂ عشق کو ماند نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ان نام نہاد مؤرخین کی جانب سے جو شکوک وشبہات پیش ہوئے ہیں

ان کا معروضی مطالعہ کیا جائے، بعدہٗ تشفی بخش اور تحقیقی و معقول جواب دے کر عام ذہنوں کو زنگ لگنے سے بچایا جائے!

زیر نظر کتاب ''دفاعِ سیرت طیبہ ﷺ'' اسی عظیم مقصد کی تکمیل کی اہم کڑی ہے جو جناب مفتی محمد اشرف عباس قاسمی استاذ دارالعلوم جیسے باہمت و باذوق نیز محنتی و صاحب زبان وقلم کی کاوش ہے، پوری دیانت داری کے ساتھ مصنف موصوف نے اپنا معروضی مطالعہ اور سیرت طیبہ پر ہونے والے اعتراضات کے محققانہ جواب سے کتاب کو مزین کیا ہے اور بڑے سلیقے سے ان اتہامات کا علمی تعاقب کیا ہے۔

یہ مکمل تحریر رسالہ ''دارالعلوم'' میں جستہ جستہ شائع بھی ہو چکی ہے، ناظرین واکابرین کی پسندیدگی وقبولیت بھی حاصل کر چکی ہے، اب وہی تحریریں مرتب اور کتابی شکل میں زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس علمی کاوش کو قبول کر کے مفید عام کرے! آمین

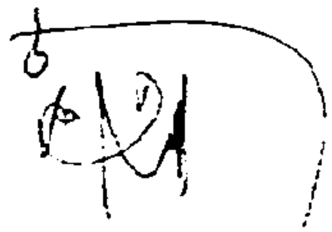

ارشد مدنی

صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

۱۲/۱/۴۵ھ

تبریک

حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

جناب مولانا مفتی اشرف عباس صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند کی کتاب ''دفاعِ سیرت طیبہ'' پیش نظر ہے۔ یہ کتاب مضامین کی شکل میں قسط وار ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہو چکی ہے، بندہ نے بھی ان مضامین کو دیکھا۔ اس کا موضوع بہت اہم ہے۔

مستشرقین اور اعدائے اسلام کی طرف سے رحمت عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ حیات پر جو کیچڑ اچھالے جاتے ہیں، ان کا جائزہ لے کر مضبوط دلائل اور حوالہ جات کے ذریعہ ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو استفادے کی توفیق بخشے، آمین!

(دستخط)

ابوالقاسم نعمانی

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۸/۱/۱۴۴۵ھ

۶/۸/۲۰۲۳ء

تقدیم

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

نکٹوں کی بستی میں کوئی صحیح سالم اوراونچی کھڑی ناک والا شخص پہنچ جائے تو پوری بستی میں وہی عیب دار سمجھا جائے گا، بدمعاشوں کے محلہ میں شرافت ہی کمزوری سمجھی جائے گی، بروں کے بیچ اچھوں کو ہی برا سمجھا جاتا ہے، یہ انسانی کمزوری رہی ہے کہ جب کسی شخص کے کمالات کی برابری نہیں ہوسکتی، اوراس کے کمال کے اعتراف کا ظرف بھی نہ ہوتو پھر اس کے کمالات کو ہی عیب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، یا پھر فرضی اتہامات اور بے بنیاد الزامات سے اس کی شخصیت کوداغدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دنیا میں اچھے اورنیک لوگوں کا سب سے اعلیٰ طبقہ انبیا کرام کا رہا ہے، ان پر کیا کیا اتہامات نہیں تراشے گئے، حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں بائبل میں کیسی خرافاتی روایت ہےاور جو وہاں سے چل کر مفسرین تک پہنچ گئی کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کا نام شیطان کے نام پر رکھا، حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام پر کیسے گھناؤنے الزامات لگائے گئے، حضرت یوسف علیہ السلام کی کردار کشی ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پاک دامنی کوایک عصمت باختہ کے ذریعہ تارتار کرنے کی کوشش کی گئی، حضرت مریم علیہا السلام کے دامن عفت پر یہودیوں نے کیسے گھناؤنے اتہامات تراشے جوآج بھی ان کی مذہبی کتابوں کا حصہ ہیں، اب اگر کوئی فخر موجودات آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رخ روشن کواپنے الزامات سے دھندلا کرنا چاہتا ہےاور چاند پر تھوکنا چاہتا ہے تواس میں

حیرت کی بات نہیں، شرار بولہبی کا تو کام ہی یہی ہے کہ وہ چراغ مصطفوی سے ستیزہ کار رہے، ہر آن خدا کے روشن کیے ہوئے فانوس کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس کی حفاظت خدا کرے وہ چراغ آندھیوں میں بھی روشن رہتا ہے، اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی روشنی کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تقریباً پانچ صدیاں کچھ اس طرح گذر گئیں، جن میں انسانیت پستی کی آخری انتہا کو پہنچ گئی، پوری دنیا میں فساد پھیل چکا تھا، ذات پات کی تقسیم عام تھی، لوگوں کو مختلف طبقات اور خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا، خاندان شرافت کا معیار تھا، علم اور اقتدار پر کچھ خاص لوگوں کی اجارہ داری تھی، خدا کا نام اجنبی بن چکا تھا اور شیطان کی پرستش عام تھی، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجا، آپ نے دنیا میں وحدت الہ اور وحدت انسانیت کے پیغام کو عام کیا، عام اعلان فرمایا کہ خدا ایک ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ پوری دنیا کے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ان میں ایک دوسرے کیلئے اخوت اور بھائی چارہ کا جذبہ ہونا چاہئے، کچھ ہی عرصہ بعد یہ انقلاب رونما ہوا کہ جو خود راہ پر نہ تھے وہ اوروں کے ہادی بن گئے، ہدایت کا یہ کارواں بڑھتا رہا، مشرق سے مغرب کی طرف، زمین سے سمندر کی طرف، ظلمت سے روشنی کی طرف، جہل سے علم کی طرف، ظلم سے انصاف کی طرف، حتی کہ مشرق ومغرب کی بڑی طاقتیں اسلام کے زیر نگیں آگئیں؛ لیکن اسلام نے دنیا کو پہلی بار بتایا کہ عقیدہ میں جبر کی کوئی گنجائش نہیں، کسی عقیدہ پر مجبور کرنا درحقیقت اس عقیدہ کی توہین ہے کیونکہ اگر اس عقیدہ میں فکر میں طاقت ہوتی تو وہ خود اپنا پیغام منواتا، جبر کا سہارا نہ لیتا۔

جب مسلمانوں کی عیسائیوں سے سیاسی آویزش شروع ہوئی اور فتوحات کا دائرہ بڑھنے لگا تو سیاسی کمزوری کا مداوا انہوں نے بے بنیاد اتہامات اور الزامات میں تلاش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سیرت کو داغدار کرنے کی کوشش کی، کبھی آپ کی ذاتی زندگی کو نشانہ بنایا گیا، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجبوری اور دفاع میں کی گئی جنگوں کو ہدف بنایا گیا، کبھی

بت المومنین کے سلسلہ میں منافقین کے اتہامات کو اچھالا گیا، کبھی سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں نہایت ضعیف اور من گھڑت روایات کو ہی اصل ماننے اور منوانے کی کوشش شروع ہوئی۔

سیرت نبوی ﷺ کو داغ دار کرنے کی کوشش صرف اسی جانب سے نہیں ہوئی جن کو اسلام نے اہل کتاب کا تمغہ دیا تھا؛ بلکہ انیسویں صدی میں اس گروہ نے بھی سیرت نبوی ﷺ پر حملے کرنے شروع کیے جس کے اپنے دیوتاؤں کی زندگی ان کی مقدس کتابوں کی روشنی میں ایسی ہے جس کو بیان کرتے ہوئے قلم کو بھی حیا آئے، اور چاہ کر بھی ان صفحات میں اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، جس کو شوق ہو وہ ''تحفۃ الہند'' میں اس کو ملاحظہ کر سکتا ہے، اس گروہ کو جب سے طاقت اور اقتدار ملا ہے، اس نے اسلام اور سیرت پاک ﷺ پر حملے تیز کر دیے ہیں اور آئے دن اس کی شدت اور حدت بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ چاند کی طرف تھوکنے سے اپنا ہی چہرہ خراب ہوتا ہے، اور آپ ﷺ پر الزامات لگانے والوں کی طویل تاریخ صرف یہ بتانے کیلئے کافی ہے کہ کتنے نادانوں نے سعی لاحاصل میں اپنی زندگی برباد کر دی، کاش انہوں نے اپنی زندگی کی قدر و قیمت سمجھی ہوتی اور سچائی کو جاننے، سمجھنے اور اس کا اعتراف کرنے کی کوشش کی ہوتی؛ آج بھی جب کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت وسوانح پر مختلف زاویوں سے حملے کیے جا رہے ہیں، ورفعنا لک ذکرک کی کتنی عمدہ مثال ہے کہ مغرب میں بچوں کا سب سے مقبول نام ''محمد'' ہے۔

آپ ﷺ کے جو احسانات اس امت پر ہیں، وہ کوئی چاہے تو جان دے کر بھی ادا نہیں کر سکتا، بھلا آپ ﷺ کی غم خواری، غم گساری، امت کیلئے درد، تڑپ اور کڑھن کا بدلہ کوئی کیسے دے سکتا ہے، ہماری جانب سے تو اس کا ادنی صلہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی محبت دنیا کی ہر شے سے زیادہ محبوب، آپ ﷺ کا ایمانی رشتہ ہر رشتہ داری سے زیادہ عزیز اور آپ کے احکام کی تعمیل زندگی کا نصب العین ہو جائے، تب بھی حقیقت یہی ہوگی:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سیرت کو اپنے زبان وقلم سے داغدار کرنے والے صرف اپنے باطنی خبث کا ہی اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ اپنے ہم قوموں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات کو چھپانا چاہتے ہیں، کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت اور انسانیت کی نجات پر مبنی تعلیمات عام ہو گئیں تو قبول اسلام کی رفتار تیز نہ ہو جائے، ان کے ہم مذہب دیو مالائی مذہب کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار نہ پھینکیں۔

اس صورت حال میں ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ممکن حد تک بتائے کہ آپ کی اصل سیرت کیا ہے اور آپ کی تعلیمات کیا ہیں؟ لیکن اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری علماء کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے جانے والے اتہامات والزامات کی نہ صرف تردید کریں بلکہ آپ کی پرنور سیرت اور تعلیمات پر جو اعتراضات والزامات کے بادل امڈ رہے ہیں، ان کو صاف کریں تاکہ دنیا خود اسلام اور پیغمبر اسلام کو اصل صورت میں دیکھ سکے اور پرکھ سکے۔

عزیز گرامی قدر مولانا محمد اشرف عباس صاحب قاسمی زیدفضلہ نے سیرت طیبہ کے ان پہلوؤں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے، جو عام طور پر معترضین کے اعتراضات کی زد میں رہتے ہیں؛ حالانکہ ان اعتراضات کی کوئی بنیاد نہیں؛ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ناواقف اور سادہ طبیعت کے لوگ ان اعتراضات سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہو ہی جاتے ہیں، ایسے میں ان اعتراضات کا علمی اور تحقیقی جواب دینا وقت کی ضرورت ہے، مولانا محمد اشرف عباس صاحب نے دفاع سیرت طیبہ کے نام سے وقت کی اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مولانا محمد اشرف عباس قاسمی علم وتحقیق کی دنیا میں ابھرتے ہوئے نوجوان فاضل ہیں، جو جذبہ محنت سے سرشار اور تصنیفی شعور سے آراستہ ہیں، دارالعلوم دیوبند کے کامیاب اور مقبول استاذ ہیں، مجھے بڑی مسرت ہے کہ جب المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر ایک بیش قیمت سیمینار رکھا گیا تھا، جس کے مرکزی موضوعات میں سے ایک موضوع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط

فہمیاں بھی تھیں، تو اس میں انہوں نے ''کم سنی کے باوجود ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نکاح'' پر مقالہ لکھا تھا، یہ مقالہ نہایت پسند کیا گیا، ماشاء اللہ سمینار سے متعلق مقالے کی یہ دعوت ان کے لیے ایک تحریک بن گئی اور انہوں نے اس کو مستقل موضوع بنا کر مقالات کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کو کامیاب اور قبول فرمائے یہ یقیناً اہل علم اور اصحاب فکر کیلئے ایک علمی سوغات اور چشم کشا کوشش ہے، خدا کرے کہ ان کی یہ کتاب مقبول، نافع اور مفید ہو، اور ان کا علم و تحقیق کا سفر ہمیشہ جاری اور رواں دواں رہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

خالد سیف اللہ رحمانی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

۱۱/ربیع الاول ۱۴۴۵ھ

۲۷/ستمبر ۲۰۲۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رخِ روشن کو داغ دار کرنے کی کوششیں

چھٹی صدی عیسوی میں سسکتی، بلکتی اور گم گشتۂ راہ انسانیت کی ہدایت کے لیے جب خلاق ازل نے ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو جہاں سعید روحوں نے آپ کی آواز پر لبیک کہا، راہ کی مشکلات اور طاغوتی طاقتوں سے متاثر ہوئے بغیر حق پرستی اور عزیمت کی نئی تاریخ رقم کی؛ وہیں انجام سے بے خبر شیطانی ٹولے نے نہ صرف یہ کہ اس صداقت کو قبول نہیں کیا؛ بلکہ اس نورِ حق کو اپنے پھونکوں سے بجھانے اور چراغِ مصطفوی کو شرارِ بولہبی سے گل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، روزِ روشن کی طرح واضح دلائل نبوت اور انتہائی جامع ومتوازن شرائع واحکام میں شکوک وشبہات پیدا کر کے خدا کے بندوں کو خدا سے دور رکھنے کی مہم چھیڑ دی؛ لیکن وہ اپنی ان کوششوں سے اسلام کے بڑھتے قدم کو نہ روک سکے، چنانچہ نورِ حق کی شعائیں پھیلیں اور پھلتی ہی چلی گئیں اور ظلمت کے پجاری خائب وخاسر ہوئے۔

اسلام مخالف چار محاذ اور ان کا حال

قرآن کریم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت اسلام مخالف خیمے میں بہ تدریج چار جماعتیں اکٹھی ہو گئی تھیں:

(۱) کفار ومشرکین (۲) یہود (۳) نصاریٰ (۴) منافقین۔

دلائل وبراہین کے اعتبار سے قرآن مقدس نے چاروں گروہوں کو مغلوب کر کے سب پر اپنی برتری ثابت کر دی اور کسی کے پاس کچھ نہیں رہ گیا جس کے ذریعے وہ اسلام کے خلاف حجت قائم کر سکیں اور قادرِ مطلق نے صاف اعلان کر دیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [۱]

''اور آج کے دن تمہارے لیے میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارے دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔''

اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ [۲]

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس کی طرف سے قبول نہ ہوگا''۔

اور ظاہری وجود کے اعتبار سے ان میں سے مکہ کے کفار و مشرکین نے لاکھ جتن کیے؛ لیکن فتح مکہ کے ساتھ ہی ان کی رہی سہی شان و شوکت بھی صحرائے عرب میں دفن ہوگئی، بڑی تعداد نے حق کو قبول کر لیا اور جو نہیں مانے وہ بے نام و نشان مٹ گئے، حتیٰ کہ جزیرۃ العرب شرک اور بت پرستی کی آلائشوں سے پاک ہوگیا۔

منافقین جنھوں نے مدینہ منورہ کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا اور دیگر تینوں اسلام مخالف طاقتوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام کی بیخ کنی کرتے رہے؛ وہ بھی ان طاقتوں کے کمزور ہوتے ہی پسپا ہوتے گئے اور ان کی جمعیت منتشر ہوگئی۔

تحریک استشراق کا پس منظر

جہاں تک تعلق ہے یہود و نصاریٰ کا تو ان کے پاس اپنی تہذیب، اپنی کتاب اور علم و معرفت کا کچھ نہ کچھ سرمایہ تھا، جس کی بنا پر انھیں یقین تھا کہ یہی نبی برحق ہیں اور دین اسلام ہی دین برحق ہے؛ چنانچہ قرآن کریم نے ان کے بارے میں کہا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ [۳]

[۱] المائدہ: ۳ [۲] آل عمران: ۸۵ [۳] البقرۃ: ۱۴۶

”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجود یہ کہ خوب جانتے ہیں اخفا کرتے ہیں۔“

اس علم ویقین کے باوجود انھوں نے حق کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انبیاء کی تعلیمات میں لفظی ومعنوی تحریفات اور کتمان سے کام لیا، میثاق مدینہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے گئے عہد وپیمان کی خلاف ورزی کی، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زہر کھلاکر اور پتھر گراکر جان لینے کی مذموم سازش کی اور کئی طرح کی خباثتوں کے مرتکب ہوئے جس کی بنا پر انھیں بھی اولاً مدینہ منورہ سے اور ثانیاً جزیرۃ العرب سے جلاوطن ہونا پڑا۔ ان کی سیادت واجارہ داری پر ضرب کاری لگی، ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا کہ آخری نبی بھی بنی اسرائیل میں ہی مبعوث ہوں گے؛ جس سے یہ حسد اور عصبیت کی وجہ سے تلملا اٹھے اور اسلام وپیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات اپنی نسلوں کو منتقل کرتے گئے اور جوں جوں اسلام کا عروج ہوتا گیا ان کا جذبۂ عداوت دوآتشہ ہوتا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اہم مذہبی مقامات بیت المقدس وغیرہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں آگئے اور بعد کی صلیبی جنگوں میں بھی وہ مسلمانوں کو زیر نہ کرسکے اور ان تمام ادوار میں اسلام ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب کی حیثیت سے دنیا میں پھیلتا گیا، اس صورت میں یہود ونصاریٰ کو خطرہ محسوس ہوا اور پے درپے ناکامیوں کے بعد اپنے ہم مذہبوں کو اپنے مذہب پر باقی رکھنے اور اسلام کی تہذیبی ونظریاتی برتری کو ختم کرنے کے لیے اسلامی علوم وفنون پر گہرائی کے ساتھ مطالعے کی طرح ڈالی اس طرح تحریک استشراق وجود میں آئی۔

ایک رائے کے مطابق اس تحریک کا آغاز ۱۳۱۲ء میں ہوا، جب فینا میں کلیسا کی کانفرنس ہوئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ یورپ کی جامعات میں عربی، عبرانی اور سریانی زبان کی تدریس کے لیے پیرس اور یورپ کے طرز پر چیئرز قائم کی جائیں۔

استشراق اور مستشرق

استشراق، شرق سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے روشنی اور چمک۔ مجازی طور سے سورج کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح سورج طلوع ہونے کی جگہ بھی مشرق کہلاتی ہے۔ (لسان العرب/۱۷۴۱) س ت طلب کے لیے ہونے کی وجہ سے استشراق کا مطلب ہوا مشرق کی طلب، مشرق کی یہ طلب علوم مشرق، آداب، لغات اور ادیان تک دراز ہے، صرف جغرافیائی مفہوم میں محدود نہیں ہے۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے المنجد میں مستشرق کا معنی بتایا گیا ہے۔

"العالم باللغات والآداب والعلوم الشرقية، والاسم استشراق" [1]

''مشرقی زبان، کتابیں اور مشرقی علوم وفنون سے واقفیت رکھنے والے کو مستشرق کہا جاتا ہے اور تحریک کا نام استشراق ہے''۔

مستشرق کا حقیقی مفہوم

یہ مستشرق کا عام اور سادہ سا مفہوم ہے کہ کوئی مغربی مفکر اور عالم اگر قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام جیسے فنون میں مہارت حاصل کرے اور اسے وظیفۂ زندگی بنا لے تو وہ مستشرق ہے؛ لیکن حقیقت واقعہ کے اعتبار سے اتنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ یہ ضروری اضافہ کرلیجیے کہ علوم مشرق اور اسلامیات کا یہ مطالعہ صرف علم وآگہی میں اضافے اور جہالت دور کرنے کے لیے نہ ہو؛ بلکہ اس کا نشانہ اسلامی علوم کے سرمایے کی بے وقعتی اور اسلام کے احکام ومسلمات میں تشکیک وطعن پیدا کرنا ہو، اس پس منظر میں ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب نے استشراق کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ انتہائی جامع ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

الاستشراق: هو دراسات أكاديمية يقوم بها غربيون كافرون من أهل الكتاب لوجه خاص للإسلام والمسلمين من شتى الجوانب عقيدة وشريعة وثقافة وحضارة وتاريخا ونظما وثروات وإمكانات هدف تشويه الإسلام محاولة تشكيك المسلمين فيه،

---

[1] المنجد في اللغة والأعلام

وتضليلهم عنه و فرض التبعية للغرب عليهم ومحاولة تبرير لهذه التبعية بدراسات ونظريات تدعى العلمية والموضوعية بزعم التفوق العنصري والثقافي للغرب المسيحي على الشرق الإسلامي". [1]

''استشراق، مغرب کے کفار اہل کتاب کی طرف سے خصوصیت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے مختلف جہتوں یعنی عقیدہ، شریعت، تہذیب، ثقافت، تاریخ، نظام حکومت اور وسائل وامکانات سے متعلق کی گئی تحقیق اور مطالعے کا نام ہے۔ جس کا مقصد مشرق کے اسلام پر مغرب کی عیسائیت کی نسلی اور ثقافتی برتری کے زعم میں، مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم کرنے کے لیے اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنا ہے اور اس تسلط کو ایسی تحقیقات اور نظریات سے جواز فراہم کرنے کی سعی کرنا ہے جنھیں سائنٹفک اور معروضی مطالعے کا نام دیا جاتا ہے۔''

مستشرقین کے اہداف وعزائم

مستشرقین میں عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی، آپس میں زبردست مذہبی ونظریاتی اختلاف کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں ان کے درمیان مضبوط تضامن واشتراک پایا جاتا ہے۔ ان مستشرقین کی تعداد سیکڑوں میں ہے، جو دنیا کے مختلف ملکوں میں اپنے مشن میں سرگرم عمل ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے اسلامی علوم کو پڑھا، کھنگالا، مہارت حاصل کی۔ ان سے استفادے کی راہیں آسان کیں، حتیٰ کہ یہ یہود ونصاریٰ، پہلے ہی دن سے جن کا ہدف اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کرنا تھا؛ اسلامیات اور علوم کتاب وسنت کے محقق بن گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سے اسلامی علوم کی خاصی خدمت ہوئی اور بعض منصف مستشرقین نے اسلام کی آفاقی تعلیمات کے آگے سر تسلیم خم کردیا؛ تاہم مجموعی اعتبار سے ان کی تگ ودو اور انتھک جدوجہد کے پس پردہ ان کے مذموم مقاصد تھے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

---

[1] رؤیة إسلامية للاستشراق، أحمد غراب ص: ۷

’’مستشرقین کے علم وفضل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی وضاحت کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقے کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب وتمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش وجستجو میں وقت صرف کریں اور سیاسی ومذہبی اغراض کی خاطر رائی کا پربت بنائیں۔ ان کی ذہانت وطباعی کا پورا مظاہرہ چہرۂ اسلام کو بدنما دکھانے میں ہوتا ہے اور اس طرح اسلامی ممالک کے زعماء وقائدین کے دل ودماغ میں اسلام اور اسلامی قانون وتہذیب کے سرچشموں کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اور اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کردیتے ہیں کہ ان کا سارا جوش وخروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور اسلامی قانون میں اصلاح وترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہوکر رہ جاتا ہے۔‘‘ [۱]

حیاتِ طیبہ پر افتراءات

اس طرح مستشرقین نے علمی تحقیقات اور دراسات اسلامیہ کی آڑ میں اسلام کی بنیادوں پر رکیک حملے کیے، کتاب وسنت میں کیڑے نکالنے کی کوششیں کی اور سب سے زیادہ پیغمبر انسانیت رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ شخصیت کو داغ دار کرنے کی کوشش کی؛ کیوں کہ آپ ہی کی وساطت سے ہمیں دین اسلام ملا ہے، تو اس طرح انھوں نے دین کی اصل بنیاد پر ہی شکوک وشبہات کی دبیز چادر تان دینے کی سازش کی، عام طور سے لوگ کسی بھی مذہب کے داعی اور پیشوا کی شخصیت سے متاثر ہوکر اس کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں ڈالتے ہیں اس لیے انھوں نے لوگوں کو متنفر کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور آپ کی حیات طیبہ کو ہی اپنے گھٹیا حملوں کا نشانہ بنایا۔

ہم آئندہ سطروں میں ان شبہات واشکالات کا ذکر کریں گے جو مستشرقین ومخالفین اور بعض ہندو مصنفین نے بڑے شد ومد کے ساتھ اٹھائے ہیں، جن کا تعلق رسول مطہر صلی اللہ

[۱] اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین، ص ۱۳-۱۴، لکھنؤ

علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کی ذاتِ گرامی پر طعن و تشنیع سے ہے۔ اس کے ساتھ ان اعتراضات کے بودے پن اور صحیح صورتِ حال کو اللہ پاک کی توفیق سے واضح کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

رسولِ مطہر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسب و نسب پر طعن

انبیاء علیہم السلام عالی نسب ہوتے ہیں

اللہ رب العزت کی یہ سنت رہی ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جتنے انبیاءِ کرام مبعوث کیے وہ حسب و نسب کے اعتبار سے عالی اور ممتاز تھے؛ چناں چہ صحیح بخاری میں ایک طویل مکالمہ مذکور ہے، جس میں ہرقل شاہِ روم نے ابوسفیان سے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جیشِ کفار کے سالار تھے، چند سوالات کیے ہیں اور ابوسفیان نے جواب دیے ہیں۔ شاہِ روم کا پہلا سوال رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور نسب کے متعلق تھا۔ شاہِ روم قیصر نے سوال کیا: **کیف نسبہ فیکم؟** تم لوگوں میں ان کا نسب کیسا ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا: **ھو فینا ذو نسب**۔ وہ ہم میں عالی نسب ہیں۔ ابوسفیان کے اس جواب پر شاہِ روم نے جو بڑا فاضل شخص تھا، تبصرہ کرتے ہوئے کہا: **کذلک الرسل تبعث في نسب قومھا**۔ اسی طرح پیغمبر اپنی قوم میں عالی نسب ہی بھیجے جایا کرتے ہیں۔ [1]

کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان فرستادہ منتخب بندوں کو بشری خصوصیات کے اعتبار سے اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں؛ تاکہ کوئی کسی بھی جہت سے ان پر طعن نہ کر سکے اور معاشرے میں ان کے مقام و مرتبے پر انگلی نہ اٹھائی جا سکے، تو جس طرح اعلیٰ بشری خصوصیات میں عفت و حیا، شجاعت و سخاوت، صداقت و امانت، حلم و عدالت اور علم و ذکاوت شامل ہیں، اسی طرح ان میں شرافتِ نسبی بھی شامل ہے، اگرچہ صرف نسب ہی معیارِ کرامت نہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث: ۷

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی شرافت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحدیثِ نعمت کے طور پر خود اپنے نسب کی فضیلت ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

إنّ اللہ اصطفى من ولد إبراهيم إسماعيل، واصطفى من ولد إسماعيل بني كنانة، واصطفى من بني كنانة قريشًا، واصطفى من قريش بني هاشم، واصطفاني من بني هاشم۔ [1]

''اللہ تعالیٰ نے اولادِ ابراہیم میں سے اسماعیل کو، اولادِ اسماعیل میں سے کنانہ کو، کنانہ میں سے قریش کو، قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے چنا۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

''میرا سلسلۂ نسب ہر دور میں بنی آدم کے بہترین قبیلے اور خاندان میں رہا، یہاں تک کہ میں اپنے دور تک پہنچا۔'' [2]

تو جس طرح رسول مطہر صلی اللہ علیہ وسلم افضل البشر ہیں اسی طرح آپ کا نسب بھی افضل الانساب ہے اور کفار عرب جو اپنے انساب کے سلسلے میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے وہ بھی آپ کی شرافت نسبی کو خوب اچھی طرح جانتے تھے؛ اس لیے انھوں نے اس حوالے سے کبھی طعن نہیں کیا؛ لیکن مستشرقین کی تحقیق پر ناطقہ سر بگریباں ہے کہ یہ اپنے آپ کو کائنات کے سب سے اعلیٰ واشرف نسب میں بھی کیڑے نکالنے سے باز نہ رکھ سکے۔

مستشرقین کا نسب پر دو اعتبار سے طعن

مستشرقین نے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ونسب پر بہ طور خاص دو پہلوؤں سے خردہ گیری اور طعن کی کوشش کی ہے: (۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اولاد اسماعیل سے ہونا ثابت نہیں، (۲) اولاد اسماعیل کو کوئی خصوصیت اور شرافت حاصل نہیں۔ ترتیب وار دونوں بے بنیاد الزامات کا جائزہ لے کر حقیقت کی وضاحت کی جارہی ہے۔

---

[1] جامع الترمذي، حديث: ۳۹۶۴ [2] صحیح البخاری: ۵۶۶

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سیدنا اسماعیلؑ سے تعلق

مستشرقین نے بڑے زور و شور سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور عربوں کا حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہے؛ چنانچہ مشہور مستشرق ولیم میور لائف آف محمد میں لکھتا ہے:

While Mahomet's paternal line was
,nevertheless traced up by fabricated steps
Lifeof).eighteen centuries farther to Ishmael
(cvii/ 1,Mahomet

''جب کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نسب بہ ہر صورت تراشیدہ کڑیوں کے سہارے اٹھارہ صدی بیش تر اسماعیلؑ سے ملا لیا گیا ہے۔''

ایک اور مستشرق عالم منٹگمری واٹ نے اپنی طرف سے مفروضہ گڑھ لیا ہے اور کہا ہے کہ ابتداء میں مسلمانوں کو ابراہیم سے اسماعیل اور (عہد قدیم کے مطابق) عربوں کے تعلق کا علم نہ تھا، تاہم مدینہ میں یہود سے قریبی رابطے پر انھیں اس قسم کے معاملات کا پتہ چلا دیکھیے: (Muhammad at Medina p.204)

افتراء کا ردّ

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ اسماعیل علیہ السلام نے مکہ میں زندگی گزاری اور قبیلۂ جرہم میں آپ کا نکاح ہوا اور آپ ابوالعرب کہلائے۔ یہ بات قرآن مقدس اور تورات سے ثابت ہے اور بعض انصاف پسند مغربی مؤرخین نے بھی اپنی تحریروں میں اس کا اعتراف کر رکھا ہے۔

چنانچہ کم سنی میں ہی اسماعیل کو ان کی والدہ ہاجرہ کے ہم راہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اس مقام پر چھوڑا تو انھوں نے اپنے رب سے ان الفاظ میں دعا کی:

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ

إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿٣٧﴾ [١]

"اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں، تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ ابتدا ہی سے اسماعیل ارض حرم مکہ مکرمہ میں آباد ہے۔

تورات کے سفر التثنیہ میں مذکور ہے: "رب سینا سے آیا اور سعیر پر لوگوں کے سامنے روشن ہوا اور فاران کے پہاڑ سے چمکا اور القدس کے ٹیلوں سے ظہور ہوا اور اس کی دائیں جانب لوگوں کے لیے شریعت کی روشنی ہے۔" [٢]

ترجمہ عربی کے مطابق اس کی وضاحت یہ ہے کہ سیناء سے رب کا آنا کنایہ ہے تورات کے عطا کرنے سے، اور سعیر سے روشن ہونا کنایہ ہے عیسیٰ کو انجیل دینے سے اور فاران سے چمکنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اترے جانے سے کنایہ ہے۔ اس لیے کہ فاران مکہ کا ایک پہاڑ ہے۔ [٣]

امریکی دانشور جارج بش (ان کی کتاب ۱۸۳۱ء میں چھپی، یہ حضرت امریکہ کے صدر بننے والے جارج بش سینئر اور جارج ڈبلیو بش کے دور کے رشتے دار تھے) کہتے ہیں: اسماعیل سے عربوں کے نسب کی ایک دلیل یہ ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی یہودیوں اور عربوں میں ختنے کا رواج ہے۔ یہودی ختنے میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں اور عرب اسماعیل علیہ السلام کی، اس لیے کہ اسماعیل ہی عرب قوم کے بانی ہیں۔ [٤]

ان کے علاوہ بھی تاریخی کتابوں اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بیانات ہیں جن سے صاف واضح ہے کہ عربوں کا اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہونا محض اتفاقات نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعہ ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عربوں کے درمیان باقاعدہ نسب کے ماہرین موجود

---

[١] ابراہیم: ۳۷ [٢] التثنیہ: ۳۳/۲ [٣] السیرۃ النبویۃ ... قیم، عبدالستار تونسی ۲/۲ [٤] محمد مؤسس الدین الاسلامی ترجمہ عبدالرحمن الشیخ ص ۳۲ بتصرف

تھے؛ بلکہ عام طور سے عربی شخص کو اپنے خاندان کی ایک ایک کڑی یاد ہوتی تھی، اللہ پاک نے انھیں حافظے کی بھی زبردست قوت عطا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں میں خاندانی بنیاد پر فخر ومباہات عام بات تھی۔ اس صورت حال میں عربوں کو اپنے نسب سے ناواقف قرار دینا انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

منٹگمری کا یہ دعویٰ بھی صریح جھوٹ ہے کہ یہودیوں سے تعلقات کی وجہ سے عربوں اور مسلمانوں کو اس قسم کے تعلقات کا پتہ چلا، بھلا عربوں کو یہودیوں سے نسب کا سبق پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں کہ اقوام عالم میں سب سے زیادہ نسب سے واقفیت رکھنے والے عرب ہی تھے۔ انھیں گھوڑے اور اونٹ تک کے نسب معلوم ہوتے تھے تو اپنے نسب نامے کیوں کر محفوظ نہیں ہوں گے جب کہ یہ نسب آپس میں فخر ومباہات کا بھی ذریعہ تھا؛ بلکہ یہی عرب اسلام کے بعد یہودیوں سے کہا کرتے تھے: ہمارے اور تمہارے باپ ایک ہیں اور ہم انھی کے دین پر ہیں تم بھی ایسے ہی بن جاؤ۔ دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہی کعبۃ اللہ کا حج کرتے آرہے تھے اور بڑے فخر کے ساتھ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ ابرہیمؑ کے پیروکار ہیں؛ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلمانوں کو حضرت ابراہیمؑ سے حضرت اسماعیلؑ اور عربوں کے تعلق کا علم یہود کے ذریعے ہوا؛ حقیقت سے انتہائی بعید ہے۔

۲- اولاد اسماعیل سے شرافت وفضیلت کی نفی

بعض مستشرقین نے یہ راگ الاپا ہے کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی اسماعیل سے ہونا ثابت بھی ہوجائے تب بھی اس سے نسبی شرافت وفضیلت ثابت نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اسماعیل، ہاجرہ کے بیٹے ہیں اور ہاجرہ ایک باندی تھیں اور بھلا باندی اور لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہونے والے کو بھی شرافت حاصل ہوسکتی ہے؟

افتراء کا ردّ

اس بات کا بھی حقیقت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے کہ اسماعیل علیہ السلام غلام تھے، باندی کے بیٹے تھے؛ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حُر اور آزاد ہونا تو مسلم ہے اور

ظاہر ہے آزاد باپ کا بیٹا آزاد ہی شمار ہوگا؛ تورات کی ان نصوص کے مطابق جن کی رو سے باندی کے پیٹ سے اگر آقا کا بچہ جنم لے تو وہ آزاد شمار ہوتی ہے باندی نہیں رہتی۔ ان سب سے قطع نظر اصل بات یہ ہے کہ حضرت ہاجرہ باندی نہیں؛ بلکہ شہزادی تھیں۔

کیا حضرت ہاجرہ ام اسماعیل باندی تھیں؟

یہودیوں نے منصوبہ بند طریقے سے اسے خوب شہرت دی کہ حضرت ہاجرہؓ ایک لونڈی تھیں، چوں کہ غلام یا لونڈی کی نسل سے ہونا ذلت سمجھا جاتا تھا؛ اس لیے آغاز سے ہی تضحیک وتذلیل کی خاطر پہلے عربوں کو اور پھر اسلام کے آنے کے بعد مجموعی طور پر مسلمانوں کو ہاجری کہا جاتا تھا، ابن اثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ رومی تذلیل کی خاطر عربوں کو ”سارقیوس“ کہا کرتے تھے جس سے مراد سارہ کے غلام تھے۔

وكانت الروم تسمّي العرب سار قيوس يعني عبيدَ سارةَ بسبب هاجر أمّ إسماعيل. [1]

دراصل حضرت ہاجرہ کے متعلق اس جیسی بہت سی روایات اس مخصوص پس منظر میں تراشی گئی ہیں جس میں دنیوی اور روحانی لحاظ سے بڑے بیٹے کو اصل وارث و مستحق مانا جاتا ہے؛ چوں کہ حضرت اسماعیلؑ حضرت اسحاقؑ سے بڑے تھے، جیسا کہ تورات کی روایات سے معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے حضرت اسحاقؑ کو حضرت ابراہیمؑ کی برکات کا حقیقی وارث ثابت کرنے کے لیے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ پر مختلف الزامات لگائے گئے، چوں کہ دونوں بیٹوں کے والد ایک ہی تھے؛ اس لیے کوشش کی گئی کہ سارہ کا مقام اور درجہ ہر لحاظ سے ہاجرہ سے بہتر دکھایا جائے اور ثابت کیا جائے کہ اسماعیلؑ بعض وجوہ کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کے وارث نہ تھے؛ لیکن ان تمام کوششوں اور تحریفات کے باوجود خود یہودیوں کی شہادت ہے کہ حضرت ہاجرہ باندی نہیں؛ بلکہ آزاد اور شریف شہزادی تھیں۔ کئی سیرت نگار اور مؤرخین نے اس کو تفصیل سے ثابت کیا ہے۔ ہم اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

یہودیوں کے بڑے مفسر توریت ربی شلومو اسحاق نے باب ۱۶ کتاب پیدائش کی

[1] الكامل في التاريخ، ابن اثير ١/٣٠٦

تفسیر میں حضرت ہاجرہ کی بابت جو الفاظ تحریر کیے ہیں ان کا ترجمہ ہے:

''وہ فرعون (شاہ مصر) کی بیٹی تھی جب اس نے کرامات کو دیکھا جو بوجہ سارہ واقع ہوئی تھیں تو کہا کہ میری بیٹی کا اس کے گھر میں خادمہ ہوکر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہوکر رہنے سے بہتر ہے۔''

اس شہادت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ہاجرہ شاہ مصر کی دختر تھیں اور شاہ مصر پر حضرت سارہ کی عظمت اس قدر طاری ہوگئی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو بہ طور خادمہ ان کے ساتھ کر دینا اپنے اور اپنے خاندان کے لیے فخر و عزت کا باعث سمجھا۔

اس کے علاوہ عبرانی زبان میں لونڈی اور غلام کی مختلف حالتوں کے لیے ''شیبوت حرب'' ''مقنت کشف'' اور بلید بایشا'' کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اب تمام توریت کو دیکھتے جاؤ کہ ہر سہ الفاظ میں سے کوئی لفظ بھی حضرت ہاجرہ کے متعلق ساری عبرانی کتاب میں مستعمل نہیں ہوا۔

خود توریت میں بعض انبیاء بنی اسرائیل کی زوجات اور بعض انبیاء کی امہات کو لونڈی قرار دیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش کے ۳۰ باب کو پڑھ جائیں معلوم ہوجائے گا کہ:

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیوی مسماۃ لیاہ کی لونڈی کا نام زلفہ ہے اور مسماۃ زلفہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزندان مسمّٰی جد و آشر کی والدہ ہیں۔

۲۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیوی مسماۃ راحیل کی لونڈی کا نام بلہہ ہے اور مسماۃ بلہہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزندان مسمّٰی دوان و مسمّٰی نفتالی کی والدہ ہیں۔

یہ چاروں فرزند یعنی جد و آشر، دوان و نفتالی، اسرائیل کے ان بارہ فرزندوں میں سے ہیں، جن کو یعقوب و موسیٰ و داؤد و عیسیٰ علیہم السلام نے وقتاً فوقتاً برکتیں دی ہیں اور توریت کی کسی ایک جگہ میں بھی ان چاروں کو باقی آٹھ کے مقابلے میں کمتر نہیں بتایا گیا یا لونڈی کا بچہ نہیں کہا گیا۔ زلفہ اور بلہہ کے ذکر کو جانے دیجیے، خود لیاہ اور راخل کی بابت غور کرو جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی لڑکیاں اور بہ قول توریت حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیویاں ہیں؛ یہ دونوں اپنے لونڈی ہونے کا اقرار اس طرح کرتی ہیں:

’’راخل اور لیاہ نے جواب میں اسے کہا کہ ہنوز ہمارے باپ کے گھر میں کچھ ہمارا حصہ ہے یا میراث ہے، کیا ہم اس کے آگے بیگانہ نہیں ٹھہریں کہ اس نے تو ہمیں بیچ ڈالا اور ہمارا مال بھی کھا بیٹھا‘‘ [۱]

راخل اور لیاہ وہی خاتونیں ہیں جن کے فرزند موسیٰ وداؤد علیہما السلام ہیں اور یہ دونوں خود اپنی زبان سے زرخرید ہونے کا اقرار کرتی ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اہل کتاب کو کوئی حق حضرت ہاجرہ کی شان میں زبان کھولنے کا رہ جاتا ہے؟ حالاں کہ ان کے متعلق ایسا کوئی لفظ توریت میں موجود نہیں۔

اہل کتاب یہ بھی غور کریں کہ انھوں نے مصر کی شہزادی کو تو صرف؛ اس لیے لونڈی بتایا کہ اس کے باپ نے اسے خاندان نبوی کی خدمت کے لیے چھوڑ دیا تھا؛ لیکن یوسف کی بابت کیا کہیں گے جن کو مصر میں یونانیوں نے فوطی فار (عزیز مصر) کے ہاتھ بیچا تھا۔ [۲]

خود بائبل حضرت سارہ پر حضرت ہاجرہ کی افضلیت پر گواہ ہے؛ کیوں کہ سیدہ ہاجرہ کے سامنے متعدد بار فرشتہ خود کو ظاہر کر کے آپ سے ہم کلام ہوا، اور آپ کو خوشخبریاں سنائیں۔ (ملاحظہ ہو Genesis کے ابواب سولہ اور اکیس) جب کہ حضرت سارہ کے سامنے فرشتہ کبھی کسی بھی مقصد کے لیے نمودار نہیں ہوا۔‘‘ [۳]

بخاری شریف میں حضرت ہاجرہ کا تذکرہ

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل روایت مذکور ہے جس میں بادشاہ وقت کی دستبرد سے بچنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توریے اور حضرت سارہ کی عظمت و کرامت سے متاثر ہو کر بادشاہ کی طرف سے حضرت ہاجرہ کے دیئے جانے

[۱] کتاب پیدائش ۳۱، باب ۱۴، ۱۵ درس
[۲] رحمۃ للعالمین ۲ / ۷ ۳، دیوبند، النصوص الباہرۃ فی حریۃ الہاجرۃ مولوی عنایت رسول چریا کوٹی، الخطبات الاحمدیہ لاہور، سرسید احمد خاں ص ۱۲۴ - ۱۳۰
[۳] اردو ڈائجسٹ، نومبر ۲۰۱۸ وجیہ کوثر

کا تذکرہ ہے۔اس میں اخیر میں ہے:

ارجعوها إلى إبراهيم وأعطوها أجر فرجعت إلى ابراهيم عليه السلام فقالت: أشعرت أنّ الله كبتَ الكافر وأخدم وليدةً. [۱]

''بادشاہ نے کہا: سارہ کو ابراہیم کے پاس پہنچادو اور انھیں آجر (حضرت ہاجرہ) کو بھی دے دو، چنانچہ حضرت سارہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں اور ان سے کہا کہ دیکھتے نہیں اللہ پاک نے کافر کو کس طرح ذلیل کیا اور ساتھ میں ایک لڑکی بھی دلوادی۔''

اس روایت کی وجہ سے مسلمان، یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ اس امر میں متفق ہیں کہ فرعون مصر نے حضرت ہاجرہ کو حضرت سارہ کی خدمت کے لیے دیا تھا۔ (بعد میں حضرت سارہ نے خود حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کی زوجیت میں دے دیا تھا) لیکن اس جیسی روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں، بالکل بعید ہے۔ یہاں لفظ ''ولیدۃ'' باندی کے معنی میں نہیں ہے۔ عربی زبان میں جاریہ اور ولیدۃ کے الفاظ عام لڑکی کے معنی میں آتے ہیں، عربی بائبل میں سب جگہ حضرت ہاجرہ کے واسطے جاریہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ انگریزی بائبل میں سب جگہ میڈ MAID کا لفظ ہے، جس کے معنی وہی ہیں جو جاریہ اور ولیدہ کے ہیں یعنی لڑکی۔

شارح بخاری علامہ قسطلانی نے بھی یہاں ولیدہ کا معنی واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

الوليدة الجارية للخدمة سواء كانت كبيرة أو صغيرة, وفي الأصل الوليد الطفل والأنثى. [۲]

لہٰذا بخاری کی روایت سے بھی حضرت ہاجرہ کے باندی ہونے پر استدلال درست نہیں ہے۔

مستشرق مؤرخ گبن کی شہادت

اس کے علاوہ منٹگمری واٹ جیسے مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماجی

[۱] صحیح البخاری، حدیث: ۲۲۱۷، کتاب البیوع [۲] ارشاد الساری: ۵/۱۷۷

وعرفی حیثیت کو مجروح کرتے ہوئے یہ تاثر دیا ہے کہ مکہ میں بنو ہاشم کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں مالی اعتبار سے کمزور اور بے وزن خیال کیے جاتے تھے اور مالی تنگی کی وجہ سے ہی آپ نے غار حراء کی خلوت گزینی اختیار کی تھی، ظاہر ہے یہ سب بے ہودہ اور من گھڑت افسانے ہیں۔ خاندان بنو ہاشم کی عظمت وسیادت مکہ ہی نہیں پورے عرب میں مسلّم تھی۔ ہاشم نے قیصر سے جو تجارتی معاہدے کیے اور زائرین کعبہ کے لیے جس فیاضی اور سیر چشمی کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے بنو ہاشم کی وقعت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوگئی تھی اور سارا عرب ان کا احترام کرتا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی کمالات اور حسن اخلاق کی وجہ سے اعلان نبوت سے قبل ہی امین وصادق کا تمغہ عطا ہو چکا تھا اور اس قدر اکرام واحترام کسی قریشی نوجوان کو حاصل نہیں تھا۔

ہم اس باب کو خود ایک منصف مستشرق گبن کی شہادت پر ختم کرتے ہیں: گبن لکھتا ہے:

> ”محمد ﷺ کی ادنیٰ اور گھٹیا خاندانی ابتدا عیسائیوں کی بے ہودہ افترا پردازی ہے۔ وہ قبیلہ قریش اور خاندان بنو ہاشم کے سپوت تھے، جو عربوں میں سب سے زیادہ معزز، مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے موروثی پاسبان تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب، ہاشم کے بیٹے تھے وہ ہاشم جو ایسے متمول اور فیاض شہری تھے کہ انھوں نے قحط کی تکالیف سے اپنے مال تجارت کے ذریعے نجات دلائی تھی۔ مکہ جسے باپ کی فیاضی وسخاوت نے سیر کیا تھا اسے بیٹے نے اپنے عزم وحوصلے سے بچالیا۔“ [1]

●●●

[1] اردو ڈائجسٹ نومبر ۲۰۱۸ء

وحی ربانی کا انکار اور اس کی غلط تشریح

مستشرقین اور مذہب اسلام کے مخالفین نے صادق ومصدوق رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو داغ دار کرنے اور آپ کی لائی ہوئی شریعت سے اعتماد ختم کرنے کے لیے وحی ربانی اور قرآن مقدس پر ہی تشکیک کے گولے داغ دیے، وحی کے تقدس اور اس کی آئینی حیثیت کا انکار کرکے اس کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ وحی کی حقیقت ذکر کرکے مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا رد کیا جائے اور صحیح صورت حال واضح کی جائے۔

وحی کا لغوی واصطلاحی مفہوم

وحی کا لغوی معنی ہے: چپکے چپکے دل میں کسی بات کا ڈالنا، اشارہ کرنا، ابن فارس کہتے ہیں:

"الوحي الاشارة، والوحي: الكتاب: والرسالة، وكل ما ألقيته إلى غيرك حتى علمه فهو وحي كيف كان". [١]

"وحی کا معنی ہے اشارہ کرنا اور وحی کا معنی ہے: لکھنا اور بھیجنا اور ہر وہ چیز جسے آپ دوسرے کو پہنچائیں، یہاں تک کہ وہ اس کو جان لے تو وہ وحی ہے خواہ جیسے بھی ہو"۔

ابوبکر رازی کے بہ قول وحی کا اصل معنی ہے: پتھر پر لکھنا۔ [٢]

قرآن کریم میں ۷۸ مقامات پر لفظ وحی آیا ہے۔ کہیں تو بہ طور مصدر مستعمل ہے اور کہیں بہ طور فعل؛ لیکن ہر جگہ اس میں القا یعنی دل میں ڈالنے کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔

وحی کی اصطلاحی تعریف ذکر کرتے ہوئے حافظ بدر الدین عینی فرماتے ہیں:

"هو كلام الله المنزل على نبي من أنبيائه والرسول". [٣]

---

[١] معجم مقاییس اللغۃ: ٦/ ٩٣ [٢] جمہرۃ اللغۃ: ١/ ٢٣١

[٣] عمدۃ القاری: ١/ ١٤

”یعنی انبیاء ورسل علیہم السلام پر اترنے والے کلام کو وحی کہتے ہیں“۔
شیخ محمد عبدہ نے وحی کی تعریف کی ہے:

”إعلام الله لنبي من أنبيائه، فهو عرفان يجده الشخص من نفسه مع اليقين بأنه من قِبل الله تعالى بواسطة أو بدون واسطة.“ [۱]

”اللہ تعالیٰ کا اپنے کسی نبی کو خبر دینا وحی ہے، تو وحی ایک ایسی معرفت اور وجدان ہے جس کو انسان اپنے آپ سے محسوس کرتا ہے اس بات کے تیقن کے ساتھ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔

نزولِ وحی کی صورتیں

نزول وحی کے کئی طریقے ہیں جنھیں اللہ پاک نے سورۃ الشوریٰ میں ذکر کیا ہے:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ [۲]

”اور کسی بھی آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے کلام کرے، مگر یا تو اشارہ سے یا یہ کہ پردے کے پیچھے سے کلام کرے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کوئی قاصد بھیج دے پھر وہ اللہ کی وحی پہنچا دے اس کے حکم سے وہ جو چاہے، بے شک وہ بلندی والا، حکمت والا ہے“۔

تو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے پر نزول وحی کے تین طریقے اور درجے بیان کیے گئے ہیں:

وحی قلبی

پہلی صورت وحی مجرد کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ فرماتے ہیں وہ نبی کے دل میں ڈال دیتے ہیں اس طور سے کہ نبی کو اس کے من جانب اللہ ہونے کا یقین ہوتا ہے؛ چنانچہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”ان روح القدس نفث في روعي لن تموت نفس حتى تستكمل

[۱] رسالۃ التوحید، ص: ۹۶
[۲] شوریٰ: ۵۱

رزقها، فاتقوا اللّٰہ وأجملوا في الطلب" [۱]

"روح القدس نے میرے دل میں یہ بات پھونکی (ڈالی) کہ کوئی نفس مر نہیں سکتا یہاں تک کہ وہ اپنا رزق پورا پورا حاصل کر لے، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور طلب میں اچھائی اختیار کرو۔"

بعض علماء نے انبیاء علیہم السلام کے خواب کو بھی اسی قسم کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا ہے:

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ [۲]

"ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں"۔

وحی کلامی

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی واسطے کے بغیر اللہ پردے کے پیچھے سے کلام کرے۔ جیسا کہ اللہ پاک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تکلم کیا:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ [۳]

"اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا"۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں تکلم کیا۔

وحی مَلَکی

تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتے کے توسط سے وحی آئے جیسا کہ جبرئیل علیہ السلام انبیاء ورسل کے پاس اللہ کا پیغام لے کر آتے تھے۔ مکمل قرآن مجید اسی طرح نازل ہوا ہے۔ اللہ پاک نے اس کا تکلم کیا جس کو جبرئیل علیہ السلام نے سنا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا؛ البتہ اس تبلیغ وحی میں جبرئیل علیہ السلام کے تین احوال ہوتے تھے:

[۱] اخرجه ابن حبان في صحيحه والحاكم في المستدرک والطبراني في المعجم الكبير، رقم: ۷۶۹۴

[۲] الصافات: ۱۰۲

[۳] النساء: ۱۶۴

(۱) حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کیے بغیر اپنی اصلی صورت میں آتے جس پر ان کی تخلیق ہوئی ہے؛ لیکن ایسا دو یا تین بار ہی ہوا ہے۔ [۱]

(۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی آواز آیا کرتی تھی جیسی گھنٹی بجنے سے پیدا ہوتی ہے؛ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

سأل الحارث بن هشام رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف يأتيك الوحي؟ فقال: أحيانا ياتيني مثل صلصلة الجرس، وهو أشده علي، فيفصم عني، وقد وعيت عنه ما قال. [۲]

"حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا: کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی مسلسل آواز سنائی دیتی ہے اور وحی کی یہ صورت میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"ولقد رأيته ينزل عليه الوحي في اليوم الشديد البرد، فيفصم عنه، وإن جبينه ليتفصد عرقا." [۳]

"میں نے سخت جاڑے کے دن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتے دیکھا ہے، جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی۔"

(۳) جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل میں آ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پیغام پہنچا دیتے تھے؛ چنانچہ حارث بن ہشام کے سوال کے جواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا:

"وأحيانا يتمثل لي الملك رجلا، فيكلمني، فأعي مايقول" [۴]

---

[۱] دیکھیے: فتح الباری ۱/ ۱۸، ۱۹
[۲] صحیح البخاری، حدیث: ۲
[۳] بخاری، حدیث: ۳
[۴] صحیح البخاری، حدیث: ۲

''اور کبھی فرشتہ میرے سامنے مرد کی شکل میں آ کر مجھ سے بات کرتا ہے، تو جو کچھ اس نے کہا ہوتا ہے مجھے یاد ہو جاتا ہے۔''

اور جبرئیل علیہ السلام عموماً صحابی رسول حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ کی شکل میں آتے تھے۔

وحی کی مصدریت اور مستشرقین کے مغالطے

وحی کی درج بالا تعریف وتوضیح سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کا مصدر اور سرچشمہ اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ وہی انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل کرتا ہے اور انبیاء علیہم السلام اس پیغامِ الٰہی کو بندگانِ خدا تک پہنچاتے ہیں اور اللہ ہی نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی ہے جس کا آغاز غارِ حراء سے ہوا تھا، اللہ فرماتے ہیں:

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ [1]

''ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس''۔

ان حقائق کے برعکس مستشرقین نے یہ تاثر دیا ہے کہ وحی کا مصدر ومنبع خود نبی کی ذات، ان کا تخلیقی تخیل اور یہود ونصاریٰ سے حاصل کردہ افکار ومعلومات ہیں۔ اس طرح مستشرقین نے کتاب وسنت اور دین وشریعت کی اساس وحی کے من جانب اللہ ہونے کا ہی انکار کر دیا ہے اور مختلف طریقے سے مغالطہ دینے اور تشکیک کی کوشش کی ہے۔

نفسیاتی مرض اور مرگی کا اثر

مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی عناد اور تعصب کی وجہ سے شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے یہ خیال گڑھ لیا کہ نعوذ باللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نفسیاتی مرض تھا اور آپ کو ہسٹریا اور مرگی کا دورہ پڑتا رہتا تھا۔ اسی کے زیر اثر آپ کے پیش کردہ خیالات کو وحی کا نام دے دیا گیا ہے؛ چنانچہ ایک مستشرق نولڈیکے لکھتا ہے:

''يروى أن محمدًا كثيرًا ما اعترته نوبة شديدة، حتى أن الزبد كان

---

[1] النساء: ۱۶۳

يطفو على فمه، ويشحب وجهه أو يشتد احمراره--- وإن فقدان الذاكرة هو أحد أعراض داء الصرع الفعلي، ويقال: إن محمدًا كان يعاني منها منذ حداثته" [۱]

''منقول ہے کہ محمد پر بہ کثرت سخت دورہ پڑتا تھا، یہاں تک کہ ان کے منہ پر جھاگ آ جاتی، چہرے کی رنگت بدل جاتی یا وہ انتہائی سرخ ہو جاتا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یادداشت کا جاتے رہنا باقاعدہ مرگی کے مرض کا ایک اثر ہے اور کہا جاتا ہے کہ محمد بچپن سے ہی اس مرض سے دوچار تھے۔''

مشہور مستشرق ولیم میور نے لکھا ہے:

There were periods of which the excitement took the shape of trance or vision. Of these we know but little. Some carly charistian, writers have described them as epilepteic seizures, and have connected them with the symptoms noticed in his childhood. Such swoons or reveries are said sometimes to have preceded the descent of inspiration even inlaterlife. (Muhamet and Islam. p,32)

''کچھ وقفات ایسے ہوتے تھے جن میں بے قراری وجد یا کشف کی صورت اختیار کر لیتی۔ اس کے بارے میں ہم تقریباً کچھ نہیں جانتے ہیں، پہلے ادوار کے بعض عیسائی مصنفین نے انھیں مرگی کے دورے قرار دیا ہے اور ان دوروں کا تعلق ان کے بچپن میں ملاحظہ کردہ علامات سے جوڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس طرح کی غشی اور جاگتے سپنوں کی کیفیات ان کی مابعد زندگی میں بھی وحی سے پہلے واقع ہوتی تھیں''۔ [۲]

ان افترا پردازوں نے نزول وحی کی کیفیات کے سلسلے میں جو روایات وارد ہیں جن کا

[۱] تاریخ القرآن، نولدکہ: ۲۳، ۲۴

[۲] اردو ڈائجسٹ، وجیہہ کوثر، نومبر ۲۰۱۸ء

تذکرہ ماقبل میں ہو چکا ہے، انھیں غلط معنی پہنا کر اپنا مدعی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ حضرت آمنہ کو فرشتوں نے جو بشارت دی تھی، شق صدر کا جو واقعہ پیش آیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی، ان سب کو یہ مستشرقین مرگی اور موروثی طور پر دماغی مرض کے اثرات قرار دیتے ہیں۔

مرگی کی حقیقت

اس افتراء اور الزام کے بودے پن اور بے ہودگی کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے مرگی کی حقیقت، علامات اور اس پر مرتب ہونے والی کیفیات کو سمجھ لینا چاہیے! علامہ فرید وجدی اس بابت رقم طراز ہیں:

> ''مرگی ایک اعصابی بیماری ہے جو مرگی زدگان کے حسن وشعور کو زائل کر دیتی اور انھیں زمین پر گرا دیتی ہے، وہ لڑکھڑاتے ہوئے پاگلوں کی طرح سے ادھر ادھر پھرنے لگتے ہیں، بیماری کے آغاز میں جسم اکڑ جاتا اور چہرہ بے رونق اور مردہ سا ہو جاتا ہے، پھر شدت سے جسم کانپنے لگتا ہے اور جبڑے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، منہ سے خون ملی جھاگ نکلنے لگتی ہے اور ہاتھ ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں، چند لمحات کے بعد مریض اپنی پہلی حالت پر آجاتا ہے، پھر وہ نیند محسوس کرنے لگتا ہے لہٰذا سو جاتا ہے۔ پھر جب وہ بیدار ہوتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا''۔ [1]

مرگی کے الزام کا رد

اب ہم چند نکات کے ذریعے اس افتراء کا جواب دیتے ہیں:

۱- یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ودیگر تمام انبیاء کرام علیہم السلام ایسے تمام امراض واعراض سے محفوظ رہے ہیں جن سے طبیعت کو گھن اور تنفر ہو اور سماجی اعتبار سے حیثیت کو مجروح کرتے ہوں اور سارے انبیاء کرام عقل ودانش اور حکمت وفطانت کے اعتبار سے نبوت سے قبل بھی ممتاز رہے ہیں اور نبوت کے بعد بھی۔ قرآن کریم

[1] دائرۃ معارف القرن العشرین ۵/ ۴۶۸

نے خود مشرکین کو چیلنج کیا تھا کہ وہ پیغمبر میں اختلال عقل یا ذہنی فتور ثابت کر کے تو دکھا دیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ [1]

"آپ یہ کہیے کہ میں تم کو صرف ایک بات سمجھاتا ہوں وہ یہ کہ تم خدا کے واسطے کھڑے ہو جاؤ دو دو اور ایک ایک پھر سوچو کہ تمہارے اس ساتھی کو جنون نہیں ہے۔"

تو پھر نبی کو مرگی جیسے مرض سے کیسے متصف کیا جا سکتا ہے جس میں حواس قابو میں نہیں رہتے اور انسان کی عقل کام نہیں کرتی۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں:

"واعلم أن الأمة مجمعة على عصمة النبي صلى الله عليه وسلم من الشيطان وكفايته منه لا في جسمه بأنواع الأذى كالجنون والإغماء ولا على خاطره بالوساوس." [2]

"امت کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شیطان اور اس کے تصرف سے محفوظ ہیں، وہ نہ تو آپ کے جسم پر پاگل پن اور بے ہوشی جیسے امراض طاری کر سکتا ہے اور نہ آپ کے قلب پر وساوس ڈال سکتا ہے۔"

نمبر ۲- کفار قریش مرگی اور اس کے آثار و علامات سے خوب واقف تھے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی طاری ہوتی تو سب سے پہلے ان کفار کو آپ پر طعن کا موقع ملتا، لیکن کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی کا الزام لگایا ہو۔

بلکہ چند زبانوں کے ماہر محقق سیرت نگار ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں: ساٹھ سال کے مسلسل مطالعے اور تحقیق کے دوران مجھے ایک بھی روایت ایسی نہیں ملی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء یا آپ کے اجداد یا آپ کے اقارب میں سے کوئی بھی مرگی سے متاثر ہو جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے متاثر قرار دیا جائے۔ [3]

[1] سبا: ۴۶

[2] الشفا بتعریف حقوق المصطفی: ۲/۱۱۷، بیروت

[3] [illegible]

نکتہ: ۳-اکثر مستشرقین یہودی یا عیسائی ہیں؛ سوال یہ ہے کہ جس وحی کو یہ مرگی کا اثر قرار دے رہے ہیں یہ کوئی نئی چیز تو نہیں ہے؛ بلکہ یہی وحی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر بھی آتی رہی ہے تو کیا یہ اس کو بھی مرگی کا اثر قرار دیں گے، ارشاد باری ہے:

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ [۱]

''ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس''۔

خصوصیت کے ساتھ یہود کوہ طور پر تجلی رب سے بنی اسرائیل کی موت اور موسیٰ علیہ السلام کے بے ہوش ہونے پر یقین رکھتے ہیں، اس کے باوجود نزول وحی کی مذکورہ کیفیات کو کیسے مرگی قرار دے سکتے ہیں؟

نکتہ: ۴-نزول وحی کی جو کیفیات مذکور ہوئی ہیں وہ مرگی کی کیفیات سے یکسر الگ ہیں جیسے کہ وحی کے وقت سخت سردی میں پسینے سے شرابور ہو جانا، سر مبارک کو زمین کی طرف جھکا دینا، وزن کا بڑھ جانا وغیرہ غیر معمولی احوال کا پیش آنا درحقیقت وحی کی ثقالت اور عظمت کی وجہ سے تھا؛ چنانچہ اللہ پاک نے ابتداء امر میں ہی فرما دیا تھا:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ [۲]

''ہم آپ پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں''

وحی اور مرگی کی کیفیات میں فرق

نزول وحی کی کیفیات اور مرگی زدہ کے احوال میں زمین آسمان کا فرق ہے:

(الف) مرگی کا جب دورہ پڑتا ہے تو جسم ٹھنڈا پڑ جاتا ہے جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت اس کے برعکس ہوتی تھی سخت سردی کے موسم میں بھی نزول وحی کے وقت پسینے سے شرابور ہو جاتے تھے۔

(ب) مرگی زدہ شخص مخبوط الحواس ہو کر ادھر ادھر جھومتا اور زمین پر گر جاتا ہے اور اپنے آپ پر قابو نہیں رکھتا؛ جب کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ ہے کہ

[۱] النساء: ۱۶۳
[۲] المزمل: ۵

آپ کا دل بھی مضبوط ہے اور جسم بھی۔ منبر پر یا جانور کی پشت پر یا اصحاب کے درمیان بیٹھے ہوئے وحی آتی ہے اور آپؐ اسی کیفیت پر رہتے ہیں، نہ تو اِدھر اُدھر جسم ڈولتا ہے اور نہ غش کھا کر گرتے ہیں؛ حتیٰ کہ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق ایک بار کھانا تناول فرمارہے تھے اور آپ کے دست مبارک میں ایک ہڈی تھی، اسی دوران وحی کے آثار شروع ہوئے اور وحی مکمل ہونے اور اس کی کیفیت ختم ہونے کے بعد بھی وہ ہڈی اسی طرح آپ کے ہاتھ میں رہی۔ نیچے گری بھی نہیں! [۱]

(ج) مرگی زدہ شخص کو مرگی کے دوران پیش آمدہ احوال بالکل یاد نہیں رہتے؛ جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دوران آنے والی آیات کو خوب اچھی طرح سنتے اور محفوظ کر لیتے تھے اور کبھی اس شخص کے متعلق بھی دریافت فرماتے جو اس نزول وحی کا سبب بنا تھا۔

(د) مرگی کے بعد جسم میں اکڑن اور تھکن کی وجہ سے اس کے شکار شخص کو وقفۂ راحت کی ضرورت ہوتی ہے؛ تا کہ اس کا تعب والم ختم ہو سکے؛ جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی، پہلے کی طرح ہی آپ کا جسم توانا اور طاقتور ہوتا تھا۔

(ھ) مرگی زدہ شخص کو اپنے حال پر غم اور افسوس رہتا ہے؛ بلکہ بہت سے افراد اس مرض سے تنگ آ کر خود کشی تک کر ڈالتے ہیں؛ جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تو اس کے بالکل برعکس ہے، آپؐ کو اس حالت پر خوشی اور راحت محسوس ہوتی تھی اور اس کا انتظار کیا کرتے تھے، اگر کچھ عرصے تک وحی کا سلسلہ موقوف ہوا تو روایت میں ہے آپ کو بڑی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی۔

اس کے علاوہ بھی جتنے آثار مرگی کے اطباء نے بیان کیے ہیں ان میں سے ایک بھی؛ بلکہ اس جیسی کوئی چیز بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے باوجود وحی کو مرگی قرار دینا دماغی فتور کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

نکتہ:۵- محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی کا الزام عائد کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ خود مرگی کے شکار لوگ اس سے نجات کے لیے دعا کی خاطر خدمت اقدس میں

---

[۱] بخاری: ۴۷۹۵

حاضر ہوتے تھے اور مطمئن و بامراد ہو کر واپس لوٹتے تھے، تو اگر خود آپ کو یہ مرض ہوتا تو آپ اپنے لیے دعا نہ کرتے؟ چنانچہ بخاری شریف میں ہے: عطاء بن ابی رباح کہتے تھے: مجھ سے عبداللہ بن عباس نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایک ایسی خاتون نہ دکھاؤں جو اہل جنت سے ہے۔ میں نے کہا: کیوں نہیں، تو انھوں نے فرمایا: اس حبشی خاتون کو دیکھو۔ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: مجھے مرگی کا دورہ پڑتا ہے اور میرا ستر کھل جاتا ہے؛ اس لیے آپ میرے لیے اللہ سے دعا کر دیجیے! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم چاہو تو صبر کر لو اور تمہارے لیے جنت ہے اور اگر چاہو تو میں اللہ سے دعا کر دوں کہ تم کو عافیت عطا کر دے۔ اس عورت نے جواب دیا: میں صبر کر لوں گی۔ پھر اس نے عرض کیا: البتہ میں برہنہ ہو جایا کرتی ہوں۔ آپ اللہ سے دعا کر دیجیے کہ برہنہ نہ ہوا کروں؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا کر دی۔ [1]

نکتہ: ۶- مستشرقین اور ان کے ہم نواؤں کے جھوٹے ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ انھوں نے مرگی کے مرض کو نبوت اور بعثت کے وقت سے وابستہ کر دیا ہے، یعنی چالیس سال کی عمر میں نبوت کے بعد یہ مرض ظاہر ہوا، تو سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ مرض کہاں تھا اور اچانک اعلان نبوت کے بعد ہی کیسے ظاہر ہوا؟

نکتہ: ۷- یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وحی کے وقت کی شدت اور غیر معمولی کیفیت کی وجہ سے مستشرقین اس کو مرگی کا اثر قرار دے رہے ہیں تو کیا وحی کی دوسری صورتوں مثلاً خواب، القاء فی القلب اور کسی انسان کی شکل میں جبرئیل کی آمد کو وحی ربانی اور من جانب اللہ مان لیں گے۔ ہرگز نہیں، ان کا مقصد دراصل وحی اور نبوت کا ہی انکار ہے؛ اس لیے دور کی کوڑی لائے ہیں۔

بعض مستشرقین کا اعتراف حقیقت

خلاصہ یہ کہ وحی کو مرگی کا اثر قرار دینا تعصب، اندھ بھگتی اور ذہنی دیوالیہ پن کی دلیل ہے؛ اس لیے خود بعض منصف مستشرقین نے اس الزام کو انتہائی گھٹیا اور بے ہودہ قرار دیا

[1] بخاری: ۵۳۲۸، مسلم: ۲۵۷۶

ہے؛ چنانچہ انگریز مؤرخ تھامس کارلائل کہتا ہے:

”اس طرح کا الزام دلوں کی خباثت، قلوب کے بگاڑ اور جسم کی زندگی میں روح کے مرجانے کی دلیل ہے اور شاید دنیا نے کبھی اس سے زیادہ جھوٹی اور تکلیف دہ رائے کا مشاہدہ نہیں کیا۔“ [1]

امریکی قلم کار ویل ڈورانٹ نے لکھا:

”محمدؐ کے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں جو عام طور سے مرگی کے دورے کے وقت پیش آتی ہے اور نہ محمدؐ کی تاریخ میں ایسی کوئی بات ہے جس سے پتہ چلے کہ ان کی قوت عقلیہ متزلزل ہوگئی تھی جیسا کہ عموماً مرگی کے نتیجے میں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، ان کی روشن خیالی، قوت فکر، خوداعتمادی اور جسم، روح اور قیادت کی طاقت میں اضافہ ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ آپ کی عمر ساٹھ سال کی ہوگئی۔“ [2]

جرمن مستشرق میکس موسر لکھتا ہے:

بعض کی کوشش رہی ہے کہ انھیں محمد میں اعصاب کی بیماری میں مبتلا شخص نظر آئے؛ لیکن ابتدا سے لے کر انتہا تک ان کی تاریخ حیات میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کو اس کی دلیل قرار دی جاسکے۔ نیز اس کے بعد جو انھوں نے قانون سازی کی ہے اور نظام حکومت کو چلایا ہے، اس سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔“ [3]

قرآن مجید کے تورات وانجیل سے ماخوذ ہونے کا مغالطہ

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے بہت سے مستشرقین نے وحی اور قرآن کی مصدریت کا انکار کرتے ہوئے اس کو وحی ربانی اور کلام الٰہی ماننے کے بجائے نعوذ باللہ! خود پیغمبر اسلام محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق وتالیف قرار دینے پر خاصا زور صرف کیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے؛ بلکہ سابقہ آسمانی کتابوں تورات وانجیل اور بحیرا راہب وورقہ بن نوفل سے

---

[1] الابطال: ۵۵، ترجمہ محمد السباعی [2] قصۃ الحضارۃ: ۲۶/ ۳۱

[3] دیکھیے: آراء المستشرقین حول القرآن وتفسیرہ: ۱/ ۴۰۳

حاصل کردہ علوم سے ماخوذ ہے: چنانچہ مستشرق گولڈزیہر کہتا ہے:

''نبی عربی نے جو کچھ بھی پیش کیا اوران مذہبی معلومات اور آراء کا خلاصہ وآمیزہ ہے جسے انھوں نے یہودی اور مسیحی عناصر سے روابط کی وجہ سے حاصل کیا ہے اور منتخب کر کے خاص ترتیب سے پیش کر دیا ہے'' [۱]

ہرشفلید نے اپنی کتاب ''العناصر اليهودية في القرآن'' میں اس بات پر زور صرف کر دیا ہے کہ قرآن کریم انجیل کا ہی ایک ایڈیشن ہے جس کو دوسرا نام دیا گیا ہے''

مستشرق جوزیف نے الزام عائد کیا ہے کہ امانة، برکة، تبارک، کفارة، جبار، جنات عدن وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو عبرانی زبان کے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مکہ اور مدینہ میں یہود سے حاصل کیا ہے۔'' [۲]

مغالطے کی تردید: قرآن وکتب سابقہ کی تعلیمات کا موازنہ

تورات وانجیل سے قرآن مقدس کے ماخوذ ومقتبس ہونے کے الزام کے غلط ہونے کے لیے اخذ واقتباس کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ کسی بھی کتاب سے اخذ واقتباس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی کسی فکر کو کلی یا جزئی طور پر اس طرح نقل کیا جائے کہ ناقل اس میں اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ نہ کرے؛ لیکن اگر ناقل اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دے یا بعض افکار وخیالات کی تعدیل وتصحیح کر دے تو اسے نقل اور اقتباس کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن مقدس اور کتب سابقہ میں، مصدر ایک ہونے کے سبب واقعات کی یکسانیت اچنبھے کی بات نہیں ہے؛ لیکن ان واقعات میں بھی کہیں مکمل طور پر یکسانیت نہیں ہے؛ بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مقدس تناقضات، پرانے روایتی افسانوں، فرضی قصوں اور ہر طرح کی بے ہودگیوں سے بالکل پاک ہے؛ جب کہ دوسری کتابوں میں موجود مشرکانہ توہم پرستی اور مخلوق وخالق کے درمیان برابری کا تصور خود بتلاتا ہے کہ انسانی اختراع نے اس پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر تورات

[۱] نقد الخطاب الاستشراقی، دار الدار الاسلامی، ص ۳۰۳

[۲] المستشرقون والدراسات القرآنية: احمد العلوی، موقع دیوان العرب

میں خدا اور جیکوب کے درمیان کشتی کے ایک انوکھے مقابلے کا حال بیان کیا گیا ہے، جس میں جیکوب خدا کو عاجز کر دیتا ہے اور خدا اپنی تمام قدرت، الوہیت اور طاقت کے باوجود ایک فانی انسان کو جسمانی طور پر شکست نہیں دے پاتا ہے۔" [۱]

"خداوند یہوداہ کے ساتھ تھا، سو اس نے کوہستانیوں کو نکال دیا؛ لیکن وادی کے باشندوں کو نہ نکال سکا؛ کیوں کہ ان کے پاس لوہے کے رتھ تھے" [۲]

بائبل کے مطابق خدا نے یعقوب کی محبت میں "عیسو سے عداوت رکھی۔ اس کے پہاڑوں کو ویران کیا اور اس کی میراث، بیابان کے گیدڑوں کو دے دی" [۳]

کیا قرآن کریم میں اس طرح کی واہیات کہانیاں اور بے ہودہ باتوں کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے؟

انبیاء کرام علیہم السلام، اللہ پاک کے منتخب بندے اور اس کی مرضی کے نمائندے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم ان کی عظمت و تقدس کو جابجا بیان کرتا اور ان کے دامن عفت کو داغ دار کرنے کی ہر کوشش کی جڑیں کاٹ دیتا ہے؛ جب کہ دوسری کتابوں میں نہ جانے کیسی کیسی خرافات اور حیا سوز واقعات اس مقدس گروہ کے پاکباز افراد سے منسوب کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کی گئی ہے:

"اس (نوح) نے شراب پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا؛ حتیٰ کہ ان کے بیٹے حام نے انھیں اس حالت میں دیکھا" [۴]

بائبل کے بیان کے مطابق لوط کی دو سگی بیٹیوں نے انھیں شراب پلائی اور باری باری ان سے ہم آغوش ہوئیں۔ (نعوذ باللہ) [۵]

"اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی قوموں کی عورتوں سے محبت کرنے لگا اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا" [۶]

---

[۱] پیدائش: ۳۲:۲۴-۲۸ [۲] قضاۃ ۱: ۱۹
[۳] ملاکی ۱: ۲-۳ [۴] پیدائش ۹: ۶، ۹: ۲۰-۲۲
[۵] پیدائش: ۱۹: ۳۰-۳۸ [۶] (اسلاطین ۱۱: ۱-۶) (تورات وانجیل کے قصے، الحادڈاٹ کام)

کیا قرآن مقدس میں ان خرافات کے لیے جگہ ہو سکتی ہے۔اس نے تو ایسی تمام یہودی روایات کو سرے سے خارج کر کے انبیاء کرام کی عظمت اور ناموس کو اپنی بنیادی تعلیمات میں شامل کر رکھا ہے۔قرآن نے ان سب کی رسالت وصداقت اور من جانب اللہ منتخب ہونے کی گواہی دی ہے:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ [1]

"اور بیشک اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو تمام جہاں پر"

وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٨٦﴾ [2]

"نیز (ہم نے ہدایت کی) اسماعیل کو اور یسع کو اور یونس کو اور لوط کو اور ہر ایک کو تمام جہاں والوں پر ہم نے فضیلت دی"

اسی طرح یہودی ہرزہ سرائیوں کی تردید اور سلیمان علیہ السلام کی تنزیہہ کے لیے قرآن مقدس نے جہاں ان کی غیر معمولی شان وشوکت اور حکومت وسلطنت کا تذکرہ کیا وہیں ان کے علم وانابت پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۖ [3]

"اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا فرمایا"

نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿٣٠﴾ [4]

"سلیمان بہت اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع ہونے والے تھے"

قصص وواقعات کے بیان میں اس قدر واضح فرق اور عقیدۂ توحید کی ترسیخ میں قرآن کے خاص امتیاز اور کتب سابقہ کی تغلیط کے باوجود اس قرآن کو انہی کتب محرفہ کا ایڈیشن اور انہی سے ماخوذ قرار دینا ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی کے علاوہ کچھ نہیں۔

---

[1] آل عمران: ۳۳ — [2] الانعام: ۸۶

[3] النمل: ۱۵ — [4] ص: ۳۰

تردید:۲

اسلام سے پہلے عہد قدیم (تورات) کے کسی عربی ترجمے کا وجود نہیں ملتا ہے، خود مستشرقین نے اس کی صراحت کر رکھی ہے؛ چنانچہ جوئش یہودی صحائف کے بارے میں کہتا ہے: "یہ سارے صحیفے اجنبی زبان میں لکھے ہوئے ہیں اور انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں اس کی وضاحت ہے کہ اسلام سے پہلے یہود کی مقدس کتابوں کے عربی ترجمے کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ پہلا عربی ترجمہ عباسی دور خلافت کے آغاز میں ہوا ہے، ورنہ یہ ساری کتابیں عبرانی زبان میں تھیں۔"

تو پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عبرانی تورات سے کیسے استفادہ کر لیا؟ اب تو مستشرقین کو ایک نیا جھوٹ گڑھنا پڑے گا کہ رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم عبرانی زبان سے بھی واقف تھے اور عربی میں اس کا ترجمہ کرتے تھے۔ [1]

تردید:۳

یہود ونصاریٰ کے دعوائے نقل کی تردید کے لیے واضح دلیل قرآن کریم کا بار بار یہ چیلنج ہے کہ اگر قرآن انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو وہ بھی اس جیسا کلام پیش کر دیں! اگر اس قرآن کی اصل ان یہود ونصاریٰ کے پاس تھی تو انھیں قرآن کا چیلنج قبول کر کے تورات وانجیل سے اس جیسا کلام پیش کرنے کا زریں موقع ہاتھ سے بالکل نہ جانے دینا چاہیے تھا۔ قرآن کا یہ چیلنج آج بھی باقی ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ [2]

"آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات سب اس بات کے لیے جمع ہو جاویں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تب بھی ایسا نہ لا سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جاویں"۔

---

[1] اسلام سوال وجواب: شیخ محمد صالح المنجد

[2] الاسراء:۸۸

تردید: ۴

اگر قرآن کریم کتب سابقہ سے ماخوذ ہوتا تو کیا رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اس کا چیلنج دے سکتے تھے؟ کیا اس کا اندیشہ نہ رہتا کہ قرآن کی اصل تو لوگوں میں موجود اور متداول ہے تو ہوسکتا ہے کہ کوئی بھی اصل سے مراجعت کرلے اور چیلنج کا جواب لے آئے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پوری قوت اور انشراح کے ساتھ خدا کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے چیلنج کیا اور ان مدعیوں سے آج تک جواب نہ بن پڑا!

تردید: ۵

قرآن کریم کے بعض احکام وشرائع کا تورات وانجیل اور عربوں کی روایات سے ہم آہنگ ہونا؛ اس بات کی دلیل نہیں کہ قرآن کریم انہی سے ماخوذ ہے۔ اس لیے کہ قرآن ہر چیز کو ختم کردینے کے لیے نہیں آیا ہے؛ بلکہ اس کا ہدف غلطی کی تصحیح اور حق کی تثبیت ہے؛ چنانچہ اسلام نے عربوں میں موجود صفات حمیدہ سچائی، شجاعت، سخاوت اور حلم ورحمت وغیرہ کو بدلنے کے بجائے ان کی مزید ترغیب دی، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخلاقِ". [1]

"مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں"۔

اس لیے فطری بات ہے کہ قرآن نے بعض احکام وشرائع کو باقی رکھا ہے، خواہ اس کا تعلق کتب سابقہ سے ہو یا لوگوں کے عرف وتعامل سے؛ البتہ کسی غلط بات کی قرآن تصدیق نہیں کرتا ہے۔ خود ارشاد ربانی ہے:

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ [2]

"اور یہ قرآن افترا کیا ہوا نہیں ہے کہ غیر اللہ سے صادر ہوا ہو؛ بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے قبل نازل ہو چکی ہیں اور احکام ضروریہ کی تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ اس میں کوئی بات شک کی نہیں، رب العالمین کی طرف سے ہے۔"

[1] السنن الکبری للبیہقی: ۲۰۷۸۳ [2] یونس: ۳۷

تردید:۶

قرآن کریم میں بعض ایسے حقائق و واقعات بھی ہیں جن کا یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں کوئی وجود ہی نہیں ہے، مثلاً ھود، صالح اور شعیب علیہم السلام کے واقعات، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر یہ واقعات کہاں سے بیان کر دیے؟

تردید:۷

کئی بار ایسا ہوا ہے جیسا کہ اسباب نزول کی تفصیلات سے واضح ہے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آگیا یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی سوال کر لیا گیا، فوراً ہی وحی کے آثار شروع ہوئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت نازل شدہ آیت کریمہ پڑھ کر سنا دی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ تورات و انجیل سے اخذ کر رہے ہوتے تو ایسے مواقع پر مرتجلاً حکم ربانی نہ پیش کر دیتے؛ بلکہ وقت لیتے اور اصل کتاب سے مراجعت کے بعد ہی بتاتے۔

بحیرا اور ورقہ کی شاگردی کا فسانہ

بعض مستشرقین نے اپنے افتراءات والزامات کو سند دینے کے لیے یہ بھی گڑھ لیا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو بائبل کی تعلیمات بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں اور یہی دونوں آپ کے معلم اور قرآن کریم کا مصدر و ذریعہ ہیں؛ چنانچہ روسی مستشرق الیکس نے اس طرح افسانہ سازی کی ہے ”ابتدا میں محمد بحیرا راہب سرجیوس کے شاگرد تھے، لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے انھی سے تورات و انجیل کی بنیادی معلومات حاصل کیں۔“ [1]

اسی طرح منٹگمری واٹ نے لکھا ہے کہ ورقہ بن نوفل جو ایک مذہبی آدمی تھے اور عیسائی ہو گئے تھے؛ ان سے محمد متاثر رہے اور اصول دین کو حاصل کیا۔“ [2]

بحیرا سے شاگردی کی نسبت غلط ہونے کی دلیل

بحیرا راہب کی شاگردی کا جو افسانہ گڑھا گیا ہے اس کی تردید کے لیے اتنا کافی ہے

[1] الاسلام والمسیحیۃ، الیکس، ص ۶۱   [2] محمد فی مکۃ: ۷۵

یہ تاریخی طور سے صرف اس قدر ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط دو بار شام کا تجارتی سفر کیا ہے ایک بار کم سنی میں اور دوسری مرتبہ جوانی میں۔ دونوں ہی سفر میں بصریٰ کے بازار سے آگے جانا ثابت نہیں ہے اور نہ ہی بحیرا یا کسی اور راہب سے دین ومذہب سے متعلق کوئی چیز سننا ثابت ہے اور وہاں کا یہ سفر خفیہ بھی نہیں تھا۔" [1]

دلیل: ۲

بحیرا راہب اگر ایسے عظیم معلم اور باکمال شخص تھے کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نقشہ سازی کی، تو عیسائیوں کے یہاں ان کی حیات وخدمات بھی متعارف ہوتیں اور حق وصداقت کی یہ آواز مکہ کے بجائے بصریٰ سے لگائی جاتی۔

دلیل: ۳

اگر بصریٰ میں اس راہب کے پاس رک کر تعلیم حاصل کی ہوتی تو اس سفر سے واپسی کے بعد مکہ میں یہ بات معروف اور متعارف ہوتی اور آپ کے دعویٰ نبوت کے بعد مشرکین اس الزام کو خوب زور وشور سے اٹھاتے کہ آپ نے تو فلاں راہب سے یہ سب کچھ حاصل کر رکھا ہے؛ لیکن مشرکین نے ہزار طعن کے باوجود کبھی یہ الزام عائد نہیں کیا۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری فرماتے ہیں:

"پادری صاحبان نے اتنی بات پر "بحیرہ نصرانی ملا تھا" یہ شاخ وبرگ اور بھی لگادیئے کہ ۴۰ سال کی عمر کے بعد جو تعلیم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی تھی، وہ اس راہب کی تعلیم کا اثر تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تثلیث اور کفارہ کا رد، مسیح علیہ السلام کے صلیب پر جان دینے کا بطلان اس راہب کی تعلیم ہی سے کیا تھا تو اب عیسائی اپنے اس بزرگ کی تعلیم کو قبول کیوں نہیں کرتے۔" [2]

ورقہ بن نوفل کبھی آپ کے معلم نہیں رہے

وجہ:۱- اسی طرح ورقہ بن نوفل کے سلسلے میں منٹگمری واٹ نے جو دعویٰ کیا ہے وہ

[1] مناہل العرفان زرقانی: ۲/ ۳۲۶

[2] رحمۃ للعالمین ۱/ ۲۹، مکتبہ دار العلوم دیوبند

بھی سراسر جھوٹ ہے؛ اس لیے کہ کہیں سے یہ ثابت نہیں کہ ورقہ عیسائیت کے داعی اور مبلغ تھے؛ اس لیے انھوں نے حضرت خدیجہؓ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عیسائیت سے متاثر کر دیا تھا؛ بلکہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ جب آپ کو لے کر ورقہ کے پاس گئی ہیں تو انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حوالہ دینے کے بجائے کہا:

"ھٰذا النا موس الذي نزّل اللّٰہ علی موسیٰ" [1]

یعنی یہی وہ مقدس فرشتہ ہے جسے اللہ پاک نے وحی لے کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا۔"

وجہ: ۲-خود ورقہ نے وضاحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی تھی کہ یہ پیغام، اللہ رب العزت کی طرف سے ہے، اس میں آپ کے ارادے اور عمل کو دخل نہیں۔ اس حقیقت کے باوجود مستشرقین وحی کا مصدر خود ورقہ کو قرار دینے پر مُصر ہیں۔

وجہ: ۳- ورقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات وحی کے نزول کے بعد ہوئی ہے، تو ملاقات سے پہلے جو وحی آگئی وہ ورقہ کی تعلیم کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اس سے پہلے بھی آپ ان سے ملتے رہے ہوں، تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ [2]

نزول وحی کی ابتدا میں اس ملاقات کے بعد ہی ورقہ انتقال کر گئے تھے۔ تو اس کے بعد وہ کیسے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دیتے رہے؛ جب کہ وحی کا سلسلہ تو آگے تیئس سال تک جاری رہا۔

بعض مستشرقین کا اعتراف حقیقت

قرآن کو تورات وانجیل اور بحیرا و ورقہ کی تعلیمات سے ماخوذ قرار دینے کا نظریہ اس قدر غلط اور جھوٹا ہے کہ خود مستشرقین کی ایک جماعت بھی اس کے خلاف میدان میں آگئی؛ چنانچہ انگریز مستشرق لائٹنر کہتا ہے: "مجھے یہود ونصاریٰ کے دین سے جتنی واقفیت ہے اس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ محمد کا علم اس سے ماخوذ نہیں ہے؛ بلکہ بلا کسی شک وشبہ کے وہ وحی ربانی ہے۔" ہنری دی کاسٹری کہتا ہے: "یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ محمد نے کسی کتاب

[1] صحیح البخاری کتاب بدء الوحی [2] وحی اللہ حقائقہ وخصائصہ، ص ۱۲۶

مقدس کو نہیں پڑھا اور نہ اپنے دین کے سلسلے میں کسی سابق مذہب سے استفادہ کیا ہے'' [۱]

مستشرق کارلائل بحیرا راہب کے تعلق سے جو پروپیگنڈا کیا گیا ہے؛ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس راہب سرجیوس بحیرا کے متعلق کیا کہوں جس کے بارے میں خیال ہے کہ ابو طالب اور محمدؐ اس کے ساتھ ایک مکان میں ٹھہرے اور نہ یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ایک کم سن لڑکا اس چھوٹی سی عمر میں کسی بھی راہب سے کچھ حاصل کرسکتا ہے؟'' [۲]

اسلام کی اشاعت میں تلوار اور طاقت کے بے جا استعمال کا طعن

محسن انسانیت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے انسانیت کی کشت ویراں لہلہا اٹھی، حق وانصاف کا نیا دور شروع ہوا، انسانوں کے خودساختہ اصنام ونظریات کو منہ کی کھانی پڑی، گم گشتۂ راہ بندگان خدا کے دلوں میں اپنے خدائے برتر کی عظمت، یکتائی اور قوت اس طرح راسخ ہوگئی کہ پوری دنیا کی طاقت وشہنشاہیت ان کی ٹھوکروں میں آگئی، صرف تیئیس سال کے عرصے میں کیا مکہ کیا مدینہ؛ پورے جزیرۃ العرب میں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام اور شریعت کے آگے جاہلانہ تہذیب، جابرانہ نظام اور وثنیت ونصرانیت نے سپر ڈال دیے۔

''یہ مملکت (مدینہ کی ریاست) ابتداء میں ایک شہری مملکت تو تھی؛ لیکن کامل شہر میں نہیں تھی؛ بلکہ شہر کے ایک حصے میں قائم کی گئی تھی؛ لیکن اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہوئی ہے، اس توسیع کا آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ صرف دس سال بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس وقت مدینہ ایک شہری مملکت نہیں؛ بلکہ ایک وسیع مملکت کا دارالسلطنت تھا۔ اس وسیع سلطنت کا رقبہ تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ دوسرے الفاظ میں دس سال تک اوسطاً روزانہ کوئی آٹھ سو پینتالیس مربع کلومیٹر علاقے کا ملک کے رقبے میں

---

[۱] دیکھیے: الطعن في القرآن الکریم والرد علی الطاعنين، ص ۴۶، شاملہ

[۲] محمد المثل الاعلی توماس کارلیل، ص ۲۳

اضافہ ہوتا رہا۔" [1]

ظاہر ہے اس حیران کن تبدیلی اور صالح انقلاب کے پس پشت رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات ومکارمِ اخلاق، اسلام کے محاسن وخصوصیات کارگر عناصر تھے؛ لیکن برا ہو تعصب وعناد کا، کہ مستشرقین نے اسلام کی اس غیر معمولی فتح واشاعت کو بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت گیری اور سیف وسنان کی طاقت کا کرشمہ قرار دے دیا اور اسلام کے اس رخ روشن کو داغ دار کرنے کے لیے اپنی نام نہاد تحقیق کے زور پر مزعومات وافتراءات کا ایسا پلندہ تیار کر دیا ہے کہ الامان والحفیظ۔

الزام کا پس منظر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے مذہب اور نظریے کی اشاعت کے لیے تلوار اور بے جا طاقت کے استعمال کا الزام اب کافی پرانا ہو چکا ہے؛ تاہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاندین جو ہمیشہ کمزور پہلوؤں کی تلاش میں رہتے تھے، اس طرح کا بے بنیاد الزام عائد نہیں کر سکے، آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اولوالعزم خلفاء کے دور میں بھی اس طرح کی الزام تراشی سامنے نہیں آئی، ہزار سال کے بعد جب مسلمانوں کی شمشیر خارا شگاف کند پڑنے لگی، ان کی طاقت ومرکزیت کا شیرازہ بکھرنے لگا، تو عیسائی ویہودی مؤرخین ومحققین نے زور وشور کے ساتھ اس کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا اور عالمی سطح پر حکومت وطاقت کے اعتبار سے کمزور ہوتے مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کیا۔ دراصل دو سو سال تک عیسائیوں کی مذہبی وسیاسی قیادت کے گٹھ جوڑ سے جاری رہنے والی مقدس صلیبی جنگوں (۱۰۹۷ء تا ۱۲۶۸ء) میں تمام تر دسیسہ کاریوں، سازشوں، وسائل کے بے دریغ استعمال، عوام میں مسلم مخالف مذہبی جنون پیدا کرنے اور ہر قسم کے ظلم وستم کو روا رکھنے کے باوجود یورپ کو ناکامی ہاتھ لگی اور وہ سمجھ گئے کہ عسکری طاقت کے ذریعے مسلمانوں کو ختم کرنا مشکل ہے اور اس کے بعد یورپ کو علم وثقافت کی نئی روشنی بھی مل گئی، تو وہاں کے مفکرین ومحققین نے علم وتحقیق کی آڑ میں مسلمانوں پر اپنی تہذیبی برتری ثابت

---

[1] خطباتِ بہاولپور، ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

کرنے کے لیے پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تشدد پسند، تند خو اور سخت گیر فاتح قرار دیا۔ بعد کے ادوار میں ہندوستان کے مسلم فاتحین کے پس منظر میں یہاں کے ہندو مؤرخین نے بھی اس الزام کو ہوا دی۔

مستشرقین اور ہندو مؤرخین کی افترا پردازی اور اس کی حقیقت

موئیسینبر کولی اپنی کتاب "البحث عن الدین الحق" میں لکھتا ہے:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے متبعین کو تلوار پکڑا دی اور جنگی اخلاقیات کی دھجیاں اڑاتے ہوئے انھیں غلط کاری اور لوٹ مار کی اجازت دے دی اور لڑائی میں مرنے والوں کو جنت کی دائمی اور لازوال نعمتوں کی خوشخبری سنائی۔"

"تاریخ فرانس" کا مصنف گلین لکھتا ہے:

"دین اسلام کے بانی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ تمام مذاہب کا خاتمہ کر کے دین اسلام کو نافذ کریں اور ان عربوں نے طاقت کے بل پر اپنا دین مسلط کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اسلام قبول کرو یا موت کو گلے لگاؤ۔"

گلوور "تقدم التبشیر العالمی" میں لکھتا ہے:

"محمد مطلق العنان حکمراں تھے اور انھوں نے ہر اس شخص کی گردن زدنی کا عہد کر رکھا تھا جو ان کی مرضی کا غلام نہ بن سکے، انھوں نے اپنی عرب فوج کو اس پر لگا رکھا تھا کہ جو بھی ان کی مرضی مسترد کر دے اور ان کی راہ سے دوری اختیار کرے اسے موت کے گھاٹ تار دیں۔" [1]

منٹگمری واٹ "محمد فی المدینۃ" میں لکھتا ہے:

"بلا شک وشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذہن میں ایک نکتہ بھی تھا، انھوں نے مسلمانوں کو باہم لڑائی کرنے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے منع فرمایا اور مسلمانوں کی تعداد دیکھتے ہوئے سرحدی علاقوں کے قافلے لوٹنے کا حکم دیا۔"

---

[1] افتراءات المستشرقین والرد علیها، د۔ یحیی مراد، مقالہ: ڈاکٹر عماد خلیل، ص ۲۸۰-۲۸۱

ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

”ڈاکے اور جہاد میں فرق صرف نام کی تبدیلی کا ہے، اس طرح وہ کام دراصل ڈاکہ ہی تھا، اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔“ [۱]

اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ برصغیر میں انگریزوں نے دو بڑی قوموں میں منافرت بڑھانے کے لیے اس الزام کو خوب ہوا دی، چنانچہ ایسے رسالے ”سب سے پہلے ممبئی کے گورنر الفنسٹن کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئے جو بہت جلد ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیے گئے، یہاں تک کہ اسے نصاب میں شامل کر کے بچوں کو پڑھایا جانے لگا۔“ [۲]

ان جیسے انگریز مؤرخین سے متاثر ہو کر بہت بعد میں ہندو مؤرخین بھی اس راہ پر چلتے نظر آئے؛ چنانچہ مشہور ہندو مؤرخ سر جادو ناتھ نے پانچ جلدوں میں اورنگ زیب کے نام سے انگریزی میں کتاب لکھی ہے جس میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہے:

”اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے جو اپنے متبعین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوٹ مار اور خوں ریزی کو مذہبی فرض سمجھو، یہ دنیا کے امن کا دشمن ہے اور اس کی رو سے رواداری ناجائز ہے، اورنگ زیب کی عدم رواداری کا ذمہ دار اسلام تھا؛ کیوں کہ وہ شجر اسلام کا ایک پھل تھا، جب درخت ہی کڑوا ہے تو پھل لامحالہ کڑوا ہوگا۔“ [۳]

ان کے علاوہ ایشوری پرساد، سری رام شرما، آشروادی لال وغیرہ نے یہ کہہ کر تنقید کی ہے کہ اسلام کو پھیلانے کے لیے جبر وتشدد کی پالیسی اپنانے میں کوئی مضایقہ نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام پر لگائے گئے یہ الزامات حقیقت سے بعید تر ہیں، ظالموں نے یہ الزامات اس شخصیت پر عائد کر دیے جو سراپا رحمت، امن کے پیامبر، صلح ومحبت کے داعی، دنیا سے ظلم وتشدد ختم کر کے ہر صاحب حق کو اس کا حق دلانے والے اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن

---

[۱] محمد فی المدینۃ، ترجمہ: شعبان برکات، المکتبۃ العصریۃ

[۲] مختصر تاریخ ہند، سید ابوظفر ندوی، مطبع معارف، ۱۹۷۹ء

[۳] دیکھیے: کتاب کا ص ۱۶۳–۱۹۰، نئی دہلی ۱۹۷۲ء

ہیں، جن کی حیات طیبہ کے ورق ورق اور روشن تعلیمات کی سطر سطر سے انسان دوستی، کمزوروں کی دستگیری، ضرورت مندوں کی حاجت روائی اور انسانی خون کی بے پناہ وقعت واہمیت کا سبق ملتا ہے، جو صرف عالم انسانی ہی نہیں؛ بلکہ چرند و پرند، طیور و ملک اور ارض وفلک سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے، جنھوں نے اپنے سخت ترین جانی دشمنوں پر بھی عین اس وقت پیار کی شبنم چھڑکی جب آپ کے ایک اشارے پر ان کے سرتن سے جدا کیے جا سکتے تھے، صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما کثیرا۔

اشاعت اسلام میں تلوار کا کردار

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں طاقت اور تلوار کی بھی اہمیت مسلم ہے۔ ظلم وستم اور شر وفساد سے پاک معاشرے کی تشکیل میں کبھی تلوار ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے اور مسلمانوں کی تلواروں نے بدر وحنین میں ائمہ کفر کی سرکوبی اور فتنہ وفساد کا قلع قمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا؛ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر حصولیابی اور اسلام کی غیر معمولی اشاعت کو اسی تلوار کا فیض قرار دینا حقیقت سے منہ چرانا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض نہ تو نقل یعنی کتاب وسنت کی کسوٹی پر درست ہے، نہ عقلی اعتبار سے اور نہ ہی تاریخی حقائق وواقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس پہلو سے مسئلے کا مختصر جائزہ لے کر ہم ان اسباب وذرائع کو بھی واضح کریں گے جو اسلام کی اشاعت میں اختیار کیے گئے۔

کتاب وسنت کی کسوٹی پر

کتاب وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں قبول اسلام کے لیے جبر واکراہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ارشاد باری ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾ [1]

”دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔ سو جو شخص شیطان

[1] البقرۃ:٢٥٦

یا انکار کردے اور اللہ کا یقین جمالے تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں اور خوب جاننے والے ہیں۔"

اس آیت کا سبب نزول جان لینے سے صورت حال مزید واضح ہو جاتی ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنو سالم بن عوف سے تعلق رکھنے والے ایک انصاری صحابی حصینؓ کے دو بیٹے بعثت سے قبل ہی نصرانیت اختیار کر کے مدینے سے چلے گئے تھے۔ ایک زمانے کے بعد دونوں نصرانیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بہ غرض تجارت مدینہ منورہ آئے، تو ان کے والد حصینؓ ان کے پیچھے پڑ گئے کہ تمھیں اسلام قبول کرنا ہی ہوگا۔ معاملہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں واضح کر دیا گیا کہ ایمان و کفر انسان کا ذاتی معاملہ ہے، بہ جبر و اکراہ کسی کو اسلام میں داخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ [1]

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ [2]

"کیا آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان ہی لے آئیں۔"

یعنی آپ ایسا نہیں کر سکتے ہیں، نبی کا کام تبلیغ کرنا ہے، کسی کو قبول حق پر مجبور کرنا ہرگز نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی اپنے قول و عمل سے قرآن مقدس کی ہی تبیین و تشریح فرمائی ہے، تو کیا ایسے واضح قرآنی ارشادات و ہدایات کی موجودگی میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آپ نے کبھی ان کی خلاف ورزی کی ہوگی اور کسی کو اسلام پر مجبور کیا ہوگا؟ بلکہ ایک مشرک اگر مجبور و مقہور ہو کر پناہ میں آجائے تو بھی قرآن کریم نے واضح کر دیا ہے کہ اسے اسلام لانے پر مجبور نہیں کرنا ہے، اس پر موقع ہونے کے باوجود دباؤ نہیں بنانا ہے۔ اس کے سامنے اسلام اور قرآن مقدس کی اچھی طرح تبلیغ کر دو، اگر وہ نہ مانے تو بھی اس پر زیادتی کرنے کا کوئی حق نہیں؛ بلکہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کو کسی محفوظ مقام تک پہنچا دو، ارشاد ہے:

[1] تفسیر طبری ۵/۴۰۹، روح المعانی ۳/۱۹ [2] یونس: ۹۹

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۟ [1]

''اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے پناہ کا طالب ہو تو آپ اس کو پناہ دیجیے؛ تاکہ وہ کلام الٰہی سن لے، پھر اس کو اس کے امن کی جگہ میں پہنچا دیجیے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے۔''

عقل کی کسوٹی پر

جس کو بھی عقل وخرد کا ذرا حصہ نصیب ہوا ہے وہ بہ خوبی سمجھ سکتا ہے کہ بھلا محض تلوار کے زور پر اتنے کم عرصے میں اس قدر مضبوط و مستحکم اور مقبول حکومت کیسے قائم کی جا سکتی ہے؟ اگر بہ زور وزبردستی وقتی طور سے کسی پر اپنا نظریہ مسلط بھی کر دیا جائے تو وہ موقع ملتے ہی اپنی گردن سے اس کا پٹہ اتار پھینکتا ہے؛ کیوں کہ تلوار سے کسی کے دل پر حکمرانی نہیں کی جا سکتی ہے، جب کہ پوری تاریخ گواہ ہے کہ چند افراد کو چھوڑ کر جس کسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا اقرار کر لیا، زندگی کی آخری سانس تک وہ اس پر اس طرح قائم رہا کہ کوئی خوف یا کوئی طمع اس کے پائے استقامت میں جنبش نہ پیدا کر سکی، اس کے جذبۂ طاعت پر خود کفار ومخالفین دنگ رہ جاتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مکۃ المکرمہ میں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے سروسامانی کے عالم میں دعوت اسلام کا آغاز کیا، اس وقت آپ کے پاس نہ تو تلوار کی طاقت تھی اور نہ کوئی مخصوص طاقتور لابی؛ بلکہ جن سعادت مند نہتے لوگوں نے اسلام کو قبول کر لیا تھا وہی مقہور ومجبور تھے ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اور ان نومسلموں کے پاس صبر وتحمل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور اگر کوئی مذہب تلوار کے ذریعے پھیلتا تو یقیناً کفار ومشرکین کو کسی محاذ پر ہزیمت نہیں ہوتی اور اسلام کا چراغ روشن ہونے سے پہلے گل کر دیا جاتا؛ اس لیے کہ تلوار کی طاقت تو ان کے پاس تھی اور ان تلواروں کو استعمال کرنے والے مضبوط بازوؤں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

---

[1] التوبہ:٦

اپنے دین اور نظریے کی اشاعت کے لیے تلوار کا استعمال ایسا بے بنیاد اور خلاف عقل الزام ہے کہ خود ایک مستشرق تھامس کارلائل نے بھی اس کو قطعی جھوٹ قرار دیتے ہوئے لکھا:

"یہ عقل میں آنے والی بات ہی نہیں کہ ایک شخص، جو اپنی دعوت کے ابتدائی دنوں میں بالکل تن تنہا ہو، کوئی اس کو ماننے والا نہ ہو، وہ اکیلے پوری قوم اور جماعت کے خلاف تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہو اور انھیں اپنے آپ کو منوانے پر مجبور کر دے۔" [1]

تاریخ کی کسوٹی پر

پوری سیرت طیبہ اور تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانے کا الزام انتہائی غلط، من گھڑت اور صرف تعصب وعناد پر مبنی ہے۔

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال تک بے سروسامانی کے عالم میں مکۃ المکرمہ میں دین حق کی تبلیغ کی، کفار کے پاس طاقت وقوت تھی اس لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، جن گنے چنے افراد نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا ان پر سخت ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بہ جز صبر وتحمل یا دعائے ہدایت کے کچھ جواب نہ ہوتا تھا۔ اس تیرہ سالہ مکی دور کی مکمل تاریخ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان دو جملوں میں سمو دی ہے:

"لَقد أُخِفتُ في اللهِ وَ مَا يُخَافُ أَحدٌ، ولَقد أُوذِيتُ في اللهِ و مَا يُؤْذَى أَحدٌ. [2]

"دعوت الی اللہ کے سلسلے میں مجھے اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا، مجھے اتنی اذیت پہنچائی گئی کہ ایسی اذیت کسی اور کو نہیں پہنچائی جاسکتی ہے"۔

لیکن ان سخت حالات کے باوجود مقابلے کے بجائے پورے مکی دور میں قرآن کریم کے اس حکم پر عمل پیرا رہے:

---

[1] محمد المثل الاعلی، ترجمہ: محمد السباعی، ص ۲۱، مکتبۃ النافذہ، مصر، ط ۲۰۰۸ء

[2] جامع الترمذي: ۲۴۷۲

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾ [1]

''سو آپ ان سے بے رخ رہیے اور یوں کہہ دیجیے کہ تم کو سلام کرتا ہوں، سو ان کو ابھی معلوم ہو جاوے گا۔''

یعنی ان کی سخت باتوں اور تضحیک واستہزا پر نہ ان کے لیے بددعا کیجیے اور نہ ان کے جواب میں کوئی سخت بات کہیے، بس سلام اور دفع شر کی بات کر کے ان سے الگ ہو جائیے

۲- ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے تشریف فرما تھے کہ حضرت خباب ؓ بن ارت تشریف لائے اور خود پر ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اللہ کے سچے اور محبوب نبی ہیں، آخر ہمارے لیے اللہ کی مدد کیوں نہیں آتی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا: تم سے پہلے ایمان والوں کو اس طرح آزمایا گیا کہ ان کے جسموں سے لوہے کی کنگھیوں کے ذریعے گوشت نوچا گیا، انھیں آروں سے چیر دیا گیا؛ لیکن یہ سزا بھی ان کو ان کے دین سے نہیں پھیر سکی۔ اللہ اس دین کو ضرور غالب کرے گا یہاں تک کہ ''صنعاء'' سے ''حضر موت'' تک ایک شخص جائے گا جس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا؛ لیکن تم لوگ جلدی کر رہے ہو۔'' [2]

تو ظاہر ہے کہ ابتدا میں جو مسلمان ہوئے اور ۱۳ سال تک مکہ میں مسلسل ظلم و ستم سہتے رہے انھیں کس تلوار نے مسلمان کیا تھا؟

۳- مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمانوں کو مقابلے اور دفاع کی اجازت دی گئی؛ لیکن ۲ھ میں پیش آنے والی پہلی بڑی جنگ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لیے صف بندی کرنی پڑی۔ اس وقت بھی سیف وسنان کی طاقت اور وسائل کی کثرت قریش کے پاس تھی؛ لیکن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب تک کے چودہ سالہ جدوجہد کے نتیجے میں صرف ۳۱۳ مسلمان اس جنگ کا حصہ ہیں؛ لیکن صرف ایک سال بعد احد میں یہ تعداد دگنی سے بڑھ کر سات سو تک جا پہنچتی ہے، یہ اضافہ کس تلوار نے کیا تھا؟

اس کے بعد ۳ھ میں جنگ احد میں اور ۵ھ میں غزوۂ خندق میں کفار ومخالفین

---

[1] الزخرف: ۸۹

[2] بخاری، حدیث نمبر: ۳۶۱۲

ہی اپنی تلوار خارا شگاف کے ساتھ مسلمانوں کو کمزور پا کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے۔ خیبر کے یہودیوں کو غرہ تھا کہ ہم مضبوط قلعوں میں محصور ہیں اور ہماری فوجی طاقت بھی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے؛ اس لیے وہ مسلسل مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے اور ان کے خلاف اکساتے رہے۔ ۷ھ میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چودہ سو صحابہ کے ساتھ خیبر کا رخ کیا اور یہودیوں کا لشکر دس ہزار سے زائد افراد پر مشتمل تھا، تو ظاہر ہے یہاں بھی تلوار انھیں کے پاس تھی۔ اس کے باوجود ان جنگوں میں سے ہر بعد والی جنگ میں مسلمانوں کی تعداد کئی گنی بڑھتی رہی، آخر انھیں کونسی تلوار مسلمان بنا رہی تھی؟

۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر جنگ بندی اور تلوار کو نیام میں رکھنے پر مسلمانوں نے صلح کر لی تھی، جس میں مخالفین کی طرف سے مسلمانوں کو اپنی مرضی کی شرائط ماننے پر مجبور کیا گیا تھا؛ لیکن صرف دو سال کے بعد ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر حدیبیہ سے سات گنی بڑی فوج کے ساتھ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر عفو ودرگزر کا عام اعلان فرماتے ہیں۔ تلوار بندی اور صلح کے زمانے میں اتنی بڑی تعداد کو کس تلوار نے کلمہ پڑھا دیا تھا؟

اس طرح عقل، نقل اور تاریخ کی کسوٹی پر کہیں سے ثابت نہیں ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبور کر کے کسی کو مسلمان بنایا ہو۔

اسلامی جہاد اور دیگر جنگوں میں فرق

چودہ سال کے مسلسل انتہائی صبر آزما حالات کے بعد ۲ھ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو جہاد اور کافروں سے قتال کی اجازت دی گئی؛ چنانچہ حکم الٰہی نازل ہوا:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ

اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ [1]

"لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک کا دوسرے سے زور نہ گھٹاتا رہتا تو نصاریٰ کے خلوت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے اور بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو کہ اللہ کی مدد کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا غلبہ والا ہے"

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"وهي أول آية أذن فيها بالقتال بعد ما نُهي عنه في نيف وسبعين آية" [2]

"حکم قتال کے امتناع میں ستر سے زائد آیات کے نزول کے بعد یہ پہلی آیت تھی جس میں قتال کی اجازت دی گئی۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ جہاد و قتال کی مشروعیت کا مقصد دین اسلام کا دفاع، اس کی اشاعت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا، اسلام قبول کرنے کے خواہش مند افراد کو تحفظ فراہم کرنا، خدائے واحد کی پرستش اور عبادت کے تصور کو عام کرنا اور ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کر کے امن و انصاف کا ماحول قائم کرنا ہے۔

قرآن کریم میں صراحتاً لفظ جہاد چھ مقامات پر وارد ہوا ہے، اسی طرح لفظ قتال بیس مرتبہ اور اتنی ہی بار قتال کا مرادف کوئی اور لفظ استعمال ہوا ہے؛ لیکن کہیں بھی جہاد کا قتال کا مقصد یہ نہیں ذکر کیا گیا ہے کہ زبردستی لوگوں کو مسلمان بنا دیا جائے؛ بلکہ جو فتنہ پرور، ظالم اور شر پسند نہ ہوں، کفر پر باقی رہتے ہوئے بھی ان سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

---

[1] الحج: ۳۹-۴۰ [2] التفسیر الکبیر ۳۵/۲۳

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹ [1]

''اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں، صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہارے نکالنے میں مدد کی ہو اور جو شخص ایسوں سے دوستی کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی جہاد اور دوسری جنگوں میں طریقۂ کار کے اعتبار سے بھی واضح فرق ہے اور مقاصد وانجام کے اعتبار سے بھی۔

طریقۂ کار کے اعتبار سے فرق

دنیا میں لڑی جانے والی جنگوں میں عام طور سے وہ تمام حربے اور بلا دریغ قتل وغارت گری کے وہ تمام طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن سے دشمنوں کو زیر کیا جا سکے؛ اس لیے بے قصوروں اور پر امن شہریوں پر بھی توپ وتفنگ کے دہانے کھول دیے جاتے ہیں۔ بڑی تعداد میں عورتوں، بچوں اور مذہبی لوگوں کو نشانہ بنا کر استعماری جذبات کو تسکین کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جہاد کا مقصد چوں کہ قتل وغارت گری یا خوف ودہشت پیدا کرنا نہیں ہے؛ اس لیے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لیے اصول وضوابط طے کیے اور جہاد کے صحیح طریقے سے روشناس کرایا۔

[1] الممتحنۃ: ۸-۹

چنانچہ امام مسلم نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی شخص کو کسی اسلامی لشکر کا سالار مقرر کرتے تو اسے تقویٰ اختیار کرنے اور ساتھی مجاہدین کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے، پھر فرماتے: ''اللہ کے راستے میں اللہ کا نام لے کر لڑو، کافروں سے قتال کرو، لڑو اور دھوکہ وفریب نہ دو، لاشوں کا مثلہ نہ کرو، کسی نوزائیدہ بچے کو مت قتل کرو۔''

اگر جہاد کے اس طریقۂ کار اور اخلاقیات کی خلاف ورزی ہوتی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے اور محاسبہ کرتے تھے؛ چنانچہ حضرت اسود بن سریع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''كنا في غزاة فأصبنا ظفرا و قتلنا من المشركين، حتى بلغ بهم القتل إلى أن قتلوا الذرية، فبلغ ذلك النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: ما بال أقوام بلغ بهم القتل إلى أن قتلوا الذرية؟ ألا! لا تقتلنّ ذرية، قيل: لِمَ يا رسول الله، أليس هم أولاد المشركين؟ قال: أوَليس خياركم أولاد المشركين'' [1]

''ہم ایک غزوے میں تھے۔ اس میں غلبہ نصیب ہو گیا اور ہم نے مشرکین کو قتل کیا، قتل کا یہ سلسلہ اس حد تک دراز ہو گیا کہ کچھ لوگوں نے بچوں کو بھی قتل کر ڈالا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: کچھ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جن کے قتل کا سلسلہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ انھوں نے بچوں کو قتل کر ڈالا۔ خبردار! بچوں کو ہرگز قتل مت کرو، بچوں کو ہرگز قتل مت کرو، عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کیوں؟ کیا وہ مشرکین کے بچے نہیں ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تمہارے بہترین لوگ بھی مشرکین کے بچے نہیں تھے؟''

ایک غزوے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ جمع دیکھ ایک صاحب کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا، انھوں نے بتایا: ایک عورت جس کو قتل کر دیا گیا ہے اس کے پاس لوگوں کی بھیڑ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ

[1] السنن الکبریٰ للنسائی، رقم: ۸۶۱۶، کتاب السیر

عورت تو جنگ نہیں کر رہی تھی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کے مقدمے کے کماندار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا اور فرمایا: خالد سے کہو کہ عورتوں، بوڑھوں کو خدمت کرنے والے کو ہرگز قتل مت کرو۔" [1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سخت ہدایت تھی کہ فوراً ہی کسی قوم پر حملہ آور مت ہو جاؤ؛ بلکہ میدان کارزار میں بھی انہیں اولاً دعوت قبول کر لینے کا موقع دو۔

"جب بھی کسی مشرک قوم سے مقابلہ ہو تو اسے تین باتوں کی دعوت دو؛ وہ ان میں سے جس بات کو بھی قبول کر لے تو تم بھی انہیں قبول کر لو اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ؛ اور اگر وہ انکار کریں تو ان سے جزیہ طلب کرو؛ اگر وہ جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو؛ اور اگر وہ جزیہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوں تو پھر تم اللہ کی نصرت و مدد طلب کرو؛ اور ان سے قتال کرو۔" [2]

مقصد اور انجام کے اعتبار سے فرق

فتح کے بعد دنیا کے فاتحین عموماً بدمست ہو کر دشمن کے شہروں کو نذر آتش کر دیتے، بربریت کا مظاہرہ کرتے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیتے ہیں؛ لیکن پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی تمام حرکات سے منع فرما دیا ہے؛ کیوں کہ آپ کی تعلیمات کے مطابق جنگ کا مقصد فتنہ و فساد کا خاتمہ اور ظالموں کی سرکوبی ہے۔ فتح سے یہ مقصد حاصل ہو گیا، اس کے بعد ایسی کوئی بھی حرکت از سر نو فتنہ و فساد کو ہوا دیتا ہے جس کی سختی سے ممانعت کر دی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا [3]

"اور روئے زمین میں بعد اس کے کہ اس کی درستگی کر دی گئی فساد مت پھیلاؤ۔"

چنانچہ فتح مکہ کے بعد وہاں کی ایک اینٹ تک کو نقصان نہیں پہنچایا گیا، شہریوں کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی؛ بلکہ شہر کی حرمت و تقدس کا خیال رکھتے ہوئے جانی دشمنوں کی نہ صرف

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی قتل النساء، رقم: ۲۶۶۹ [2] صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۳۱

[3] الاعراف: ۵۶

جان بخشی کی گئی؛ بلکہ ان کے مکانات کو بھی جائے امن قرار دے دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا:

''اذھبو افأنتم الطلقاء، لا تثریب علیکم الیوم'' [۱]

''جاؤ تم آزاد ہو اور آج تم پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔''

عموماً جنگ وجدال کے نتیجے میں دشمنوں اور حاسدین کی تعداد میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے فاتح کی تلواریں اپنے مخالفین کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں؛ لیکن دلوں میں نفرت اور عداوت کے شعلے بھی بھڑکا جاتی ہیں؛ اس لیے مفتوح قوم کو جب موقع ہاتھ لگتا ہے وہ فاتحین سے اپنا حساب برابر کرنے میں دیر نہیں لگاتی ہے؛ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے نتائج اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ان جنگوں کے ذریعے آپ نے مخالفین کے دلوں کو فتح کر لیا اور دشمن کے بجائے دوست اور ہمدرد پیدا کیے۔ ''طائف کا محاصرہ اٹھانے کے بعد اہل طائف انتقام کے مواقع تلاش نہیں کرتے؛ بلکہ فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں، صلح حدیبیہ کی بہ ظاہر توہین آمیز شرائط کے باوجود اور قدرت رکھنے کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح جویانہ پالیسی خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے عظیم جرنیلوں کے ذہن کے رخ موڑ دیتی ہے اور وہ اسلام کے سچے خدمت گزار بن جاتے ہیں۔ مکہ کی فتح کے بعد صرف اہل مکہ ہی اس ''اخلاقی ضرب'' سے اسلام کے ہم نوا نہیں بن جاتے؛ بلکہ تمام قبائل عرب اسلام قبول کر کے اس قوت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں، بتلایئے کسی دنیوی جنگ نے بھی ایسے نتائج اخذ کیے ہیں؟'' [۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش آمدہ غزوات وسرایا کی مجموعی تعداد ۸۲ ہے، اگر ان سب کو جنگ تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان میں مقتولین کی مجموعی تعداد ۱۰۱۸ ہے، جن میں سے ۲۵۹ مسلمان اور ۷۵۹ فریق مخالف کے مقتولین ہیں۔ اس مجموعی تعداد کو ۸۲ پر تقسیم کرنے سے فی جنگ بارہ سے تیرہ افراد کا ہی اوسط نکلتا ہے۔

[۱] الشفا بتعریف حقوق المصطفی ص ۱۷۸، الرحیق المختوم، ص: ۳۷۲

[۲] عبد الرحمن گیلانی مجلہ محدث اکتوبر ۱۹۹۵

اس کے بالمقابل ان ہلاکت خیزیوں پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے جو امن کے نام نہاد علم برداران نے پہلی (۲۸ر جولائی ۱۹۱۴ءتا ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء) اور دوسری (۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء تا ۲ر ستمبر ۱۹۴۵ء) جنگ عظیم کے ذریعے دنیا پر مسلط کر دی، جس کے نتیجے میں ۶۱ ملکوں کے پانچ کروڑ افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری فرماتے ہیں:

''خیال کرو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا جنھوں نے فریقین کی صرف ۱۰۱۸ قربانیوں کے بعد اس قدر روحانی و اخلاقی و مادی و ملی فوائد حاصل کیے تھے جن کو بہ حیثیت مجموعی آج تک دنیا کی کوئی قوم اور ملک حاصل نہیں کر سکا۔ اہل دنیا کی لڑائیوں کا ذکر چھوڑو، مقدسین کی لڑائیاں اور مہا بھارت کے مقتولین کی تعداد کروڑوں سے کم نہیں، یورپ کی مقدس مذہبی انجمنوں نے جس قدر نفوس کو ہلاک کیا ان کی تعداد لاکھوں سے زائد ہے۔ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب ''اپالوجی آف محمد اینڈ قرآن'' میں مذہبی عدالت کے احکام سے ہلاکت نفوس کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی ہے، جو عیسائیوں کے ہاتھوں عیسائیوں کی ہوئی تھی'' اکیلی سلطنت اسپین نے تین لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں کو قتل کیا تھا، جن میں سے بتیس ہزار آدمی زندہ آگ میں جلائے گئے تھے۔'' [۱]

ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں:

(عہد رسالت میں) تین ملین کلو میٹر رقبہ فتح کرنے کے لیے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے شہداء کی تعداد دشمن کے مقتولین سے بھی کم ہے۔ جس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح اسوۂ حسنہ بن کر دنیا کے حکمرانوں اور فاتحوں کو بتاتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ اور ان کو شکست دینے کی کوشش ضرور کرو؛ لیکن بے جا خون نہ بہاؤ۔'' [۲]

اشاعت اسلام میں اخلاق وکردار کا اثر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور نظام کی غیر معمولی اور حیرت انگیز

[۱] رحمۃ للعالمین ۲ / ۴۷۱، مکتبہ دار العلوم دیوبند [۲] خطبات بہاولپور، خطبہ نمبر ۷

ترقی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق، قائدانہ صفات، عفوودرگزر، بصیرت وحکمت اور تعلیمات مساوات وانسانیت کو بڑا دخل ہے۔ سعید روحیں جب اسلام کو قریب سے دیکھتیں تو اسے فطرت سے قریب پا کر اور اس کی خوبیوں سے متاثر ہو کر خود ہی اسے روح کی گہرائیوں میں اس طرح بسا لیتیں کہ بڑے بڑے مظالم کے پہاڑ، حوادث کے طوفان اور طمع ولالچ کی وسیع دنیا بھی ان کے پائے استقامت میں جنبش پیدا نہیں کر پاتیں۔ ذیل کے چند نمونے دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ آپ کی تلوار کے خوف سے لوگ کلمہ پڑھتے تھے یا اخلاق کریمانہ کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے ان کے قلوب ودماغ مسخر ہوتے تھے۔

ہجرت کے چوتھے سال غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم استراحت کے لیے الگ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹ گئے، اپنی تلوار بھی اسی درخت سے لٹکا دی، ایک مشرک شخص دبے پاؤں وہاں آدھمکا اور ننگی تلوار سونت کر بولا، بتا اے محمد! اب تجھ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ اطمینان اور تسلی بھری آواز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''اللہ!'' یہ جواب سن کر اس پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار ہاتھ میں لے کر اس سے پوچھا: اب تو بتا تجھ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ اس پر وہ رحم کی درخواست کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: کیا تم مسلمان ہوتے ہو؟ اس نے صاف جواب دیا: نہیں؛ البتہ میں اس کی یقین دہانی کرتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ نہیں لڑوں گا اور نہ ہی جنگ میں آپ کے دشمنوں کا ساتھ دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جانے دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ کر کہا: میں تمہارے پاس ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہا ہوں، جو لوگوں میں سب سے بہتر ہے۔'' [1]

غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک جانی دشمن پوری طرح قابو میں ہونے کے باوجود قبول اسلام سے منع کر دیتا ہے، پھر بھی اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر تلوار کے زور پر کلمہ پڑھانا ہوتا تو اس سے بہتر موقع شاید ہی ہاتھ آتا۔ اگرچہ واقدی نے لکھا ہے کہ وہ

[1] رواہ ابو بکر الاسماعیلی فی صحیحہ

مسلمان ہو گیا اور اس سے خلقِ خدا کو بڑا فائدہ پہنچا۔

ثمامہ بن اثال یمامہ کے حاکم، اللہ کے رسول کے شدید مخالف؛ بلکہ قسم کھا رکھی تھی کہ اگر موقع ملا تو نعوذ باللہ اللہ کے رسول کا اپنے ہاتھ سے خاتمہ کر دیں گے۔ مکہ جاتے ہوئے مدینہ طیبہ کی حدود سے گزرے تو وہاں گشت پر مامور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑ سوار دستے نے انھیں گرفتار کر لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ یمامہ کا حاکم جس پر بعض صحابہ کے قتل کا بھی الزام ہے، قیدی کی حیثیت سے مسجد نبوی کے ستون سے بندھا ہوا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کرتے، دو تین دن تک اس کا خوب خیال رکھا جاتا ہے۔ عندیہ معلوم کیے جانے پر جواب ہوتا ہے: اگر آپ مجھ پر احسان کریں تو میں اسے یاد رکھوں گا اور اگر آپ مال کے خواست گار ہیں تو بتائیے فراہم کر دیا جائے گا۔ اس دوران وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور صحابہ کے رویے کا قریب سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ تیسرے دن رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بلا کسی شرط اور معاوضے کے ثمامہ کی رہائی کا حکم جاری فرما دیتے ہیں۔ ثمامہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جاتی ہیں۔ وہ آزاد ہوتے ہی جا کر غسل کرتے ہیں اور پھر کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور برملا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے ہیں: "واللہ ما كان على الارض وجهٌ أبغض إليّ من وجهك" خدا کی قسم! روئے زمین پر میرے لیے آپ کے چہرے سے زیادہ ناپسندیدہ چہرہ کسی کا نہیں تھا۔" "فقد أصبح وجهك أحب الوجوه كلها" لیکن اب آپ کا چہرہ روئے زمین پر میرے لیے تمام چہروں سے زیادہ محبوب بن چکا ہے۔" [1]

اس واقعے میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام لانے کو بھی نہیں کہا گیا۔ اس کے باوجود ایسا سخت جانی دشمن بھی آپ کی کرم گستری اور وسعت قلبی کا مشاہدہ کر کے آپ کے جاں نثاروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ میں ایسے دسیوں واقعات موجود ہیں۔

[1] صحیح مسلم: ۵۹/ ۱۷۶۲

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کبھی تلوار کی دھمکی نہیں دی؛ بلکہ ہمیشہ اپنے اخلاق و کردار کو پیش کیا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۞ [1]

''سو میں اس سے پہلے بھی ایک بڑے حصہ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں۔''

مطلب یہ ہے کہ میں ایک مدت تک تمہارے درمیان رہا ہوں، تم میرے سیرت و کردار سے واقف ہو؛ اس لیے تمہیں میری دعوت ضرور قبول کر لینی چاہیے۔

اور جب پہلی بار صفا پہاڑی پر چڑھ کر آپ نے قریش کو حق کی دعوت دی تو وہاں بھی آپ نے اپنے اخلاق و کردار کا حوالہ دے کر قریش سے پوچھا تھا کیا تم کو میری بات کا یقین آئے گا؟ تو اس پر سب نے بیک زبان کہا تھا: کیوں کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے دیکھا ہے،ہم نے آپ پر کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔

اشاعت اسلام کے ذرائع

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے نہیں؛ بلکہ اس کے ذاتی محاسن و کمالات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار سے ہوئی ہے اور تلوار اور جبر و اکراہ کو کبھی اس کا ذریعہ نہیں بنایا گیا؛ البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعتِ اسلام میں چار ذرائع کو خصوصی اہمیت حاصل ہے:

(۱) دعوت، (۲) ہجرت، (۳) مصالحت، (۴) مکاتبت۔ ان میں اصل دعوت ہے، باقی تین اس کی مختلف شکلیں اور تتمہ ہیں۔

دعوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل زندگی دعوت الی اللہ سے عبارت ہے۔ یہ آپ کا فرض منصبی اور مقاصد بعثت میں سے ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

يَٰٓأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا

---

[1] یونس:۱۶

بَلِّغْتَ رِسَالَتَهٗ [1]

"اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجیے اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نہیں پہنچایا۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ انسانیت کے سب سے کامیاب داعی اور مبلغ گزرے ہیں؛ اس لیے کہ آپ کا طریقۂ دعوت وحکمت، موعظت اور مجادلۂ حسنہ پر مشتمل تھا جس کا قرآن کریم نے حکم دے رکھا ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ [2]

"آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلائیے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجیے۔"

حکمت کے یوں تو بہت سے معانی بیان ہوئے ہیں؛ مگر ابوحیان اندلسی کی یہ تعبیر عام طور پر قبول کی جاتی ہے کہ حکمت سے مراد ایسا کلام یا سلوک ہے جس میں اکراہ وزبردستی کا پہلو موجود نہ ہو، طبع انسانی اُسے فوراً قبول کر لے اور وہ عقل وقلب دونوں کو متاثر کرے۔ [3]

اسی طرح لوگوں کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور موقع محل کے مطابق کلام بھی حکمت میں داخل ہے، موعظۂ حسنہ کا مطلب ہے کہ مخاطب کی خیر خواہی کی بات اس طرح اس کے سامنے بیان کی جائے کہ وہ اس کے لیے قابل قبول ہو اور اس کا دل اس کے لیے نرم پڑ جائے۔

مجادلۂ حسنہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مخاطب کو مطمئن اور قائل کرنے کے لیے محبت، اعتماد، معقول دلیل اور حسن استدلال سے کام لیا جائے؛ چنانچہ مدینہ کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں سے مناظرہ اسی قبیل سے ہے۔

اس کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب دعوت کو اختیار کرتے ہوئے اصول تدریج کو بھی اپنایا ہے؛ چنانچہ مکہ کا انداز الگ ہے اور مدینہ کا انداز الگ ہے۔ اور

[1] المائدۃ: ۶۷ [2] النحل: ۱۲۵ [3] البحر المحیط ۵/ ۵۳۰

ہمیشہ آپ نے دعوت میں نرم روی کو اپنایا ہے جس کی شہادت خود قرآن کریم دے رہا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ [1]

''بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تندخو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے، سو آپ ان کو معاف کر دیجیے اور آپ ان کے لیے استغفار کر دیجیے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے۔''

اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ دعوت میں جو کہ اشاعت اسلام کا بنیادی ذریعہ ہے؛ کہیں تشدد، تندخوئی اور اکراہ و جبر کا عنصر ہرگز نظر نہیں آئے گا۔

ہجرت

ہجرت اسلام کی ترقی اور اس کی بنیادوں کے استحکام کا نقطۂ آغاز ہے۔ حبشہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا، اور مدینہ منورہ ہجرت کے بعد ایک نئی اسلامی مملکت کی تشکیل عمل میں آئی اور اشاعت اسلام کی نئی تاریخ رقم ہوئی؛ لیکن یہاں بھی جبر و سختی کا کوئی مطلب نہیں ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان اصحاب کے ہمراہ ہجرت کی تھی جو انتہائی مظلوم و مقہور تھے اور انصار مدینہ جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کر رکھا تھا اور ہجرت کے بعد مسلمانوں کو پناہ اور ٹھکانہ دیا تھا، وہ بھی ہجرت سے قبل ہی آپ کی طاعت و غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال چکے تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ رقم طراز ہیں:

''ہجرت کو اسلام کی اصلی شوکت و عظمت کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اور حقیقت میں اسلام

[1] آل عمران: ۱۵۹

کی ترقی کا زمانہ اسی وقت سے شروع ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کی ابتدا ہجرت سے کی گئی؛ لیکن ہمارے سابق بیان سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی اسلام اصولاً مستحکم و مضبوط ہو چکا تھا، مکہ معظّمہ کے سب سے بڑے خاندانوں میں باوجود سخت سے سخت مزاحمتوں کے اسلام اپنا رنگ جما چکا تھا۔ مدینہ کے قبیلۂ اوس و خزرج کے لوگ اس وقت مسلمان ہوئے جب کہ اہل مدینہ کے نزدیک اسلام سے بڑھ کر کوئی جرم نہ تھا؛ اسلام کی اشاعت کی رفتار (ہجرت کے بعد) بھی ویسی ہی تھی جو قبل از ہجرت نہایت مظلومی اور بے بسی کے زمانے میں تھی۔ اسلام جس قدر پھیلا انھیں خوبیوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق اور برگزیدہ تعلیم کی وجہ سے پھیلا۔ جس نے اسلام قبول کیا بہ طوع ورغبت قبول کیا۔ غالباً کوئی مخالف بھی کسی ایک تاریخی صحیح واقعہ کے حوالے سے ثابت نہ کر سکے گا کہ کسی ایک شخص کو بھی بہ زور مسلمان بنایا گیا ہو۔" [۱]

مصالحت

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم جس مذہب کو لے کر آئے، وہ امن وسلامتی اور صلح وآتشی کا مذہب ہے۔ زندگی بھر آپ نے صلح کو ترجیحی بنیاد پر اختیار کیا، خود قرآن مقدس نے آپ کو حکم دے رکھا ہے کہ اگر فریق مخالف صلح کی پیش کش کرے تو آپ اللہ پر بھروسہ کر کے اس پیش کش کو قبول کر لیں۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ [۲]

"اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی جھک جائیے اور اللہ پر بھروسہ رکھیے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔"

میدان کارزار میں مقابلے سے پہلے اسلام، بہ صورتِ دیگر جزیہ کی پیش کش بھی اسی صلح پسند اسلامی روایت کا حصہ ہے جس کی رو سے مسلمان معمولی معاوضے کے عوض خون

[۱] اشاعت اسلام حصہ اول، ص ۴۷، ۵۴، شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند

[۲] الانفال: ۶۱

کے پیاسے جانی دشمنوں کی جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔

۶ھ میں صلح حدیبیہ کا جو انتہائی اہمیت کا حامل واقعہ پیش آیا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ وجدل سے کس قدر گریزاں تھے اور امن وسلامتی کی قیمت پر طاقت وقوت کے باوجود سخت شرائط کو بھی منظور فرمالیتے تھے۔

ذی قعدہ ۶ھ میں رسول اکرم ﷺ چودہ سو اصحاب کے ہمراہ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، لڑائی کا ارادہ بالکل نہیں تھا؛ لیکن قریش مرنے مارنے پر تیار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفیر قریش کے پاس بھیج کر واضح کردیا کہ ہم لڑنے نہیں آئے ہیں اور بہتر یہ ہے کہ قریش تھوڑی مدت کے لیے ہم سے صلح کا معاہدہ کرلیں۔ اس کے بعد بھی قریش لڑنے کے لیے ایک دستہ بھیجتے ہیں جس کو پکڑ لیا جاتا ہے؛ لیکن رسول رحمت ﷺ اسے معافی دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ قریش کی طرف سے کئی قاصد آتے ہیں؛ لیکن بات نہیں بنتی ہے۔ ادھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پھیل جاتی ہے جس سے مسلمانوں میں زبردست اشتعال اور جوش پیدا ہوجاتا ہے۔ اس ساری صورت حال کے بعد قریش صلح پر آمادہ ہوجاتے ہیں جس کی اہم دفعات یہ تھیں: فریقین میں دس سال تک لڑائی موقوف رہے گی۔ مسلمان اس سال واپس جائیں اور اگلے سال تین دن کے لیے آئیں، تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ ہو اور تلواریں بھی میان میں ہوں، جاتے وقت مکہ میں جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں، قریش میں سے کوئی مسلمان ہوکر مدینے چلا جائے تو واپس کردیا جائے اور اگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکے چلا آئے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

یہ شرطیں ظاہر ہے مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت ناگواری ہورہی تھی؛ لیکن رسول اکرم ﷺ نے خود جنگ بندی کی پیش کش کی تھی اور آپ ان سخت شرائط پر بھی رضامند ہوگئے تھے؛ اس لیے کس کو انکار کی جرأت ہوسکتی تھی۔ بعد میں یہی صلح مسلمانوں کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوئی، خود اللہ رب العزت نے اس کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔ اس صلح کے نتیجے میں اسلام کو اپنی اشاعت کی آزادی کا حق مل گیا۔ جنگ

بندی کے نتیجے میں کافروں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے اور ان کی باتوں کو سننے اور اسلام کے روحانی انقلاب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس کے اندر مسلمانوں کی تعداد دو گنی ہو گئی۔

دیکھیے جنگوں سے نہیں؛ بلکہ صلح سے اسلام کو غیر معمولی اشاعت نصیب ہوئی۔ اس طرح صلح خود اسلام کی ضرورت ہے۔

مکاتبت

۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد جب قریش کی طرف سے ایک گونہ اطمینان ہوا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ بلا تفریق رنگ و نسل اور قوم و وطن پوری دنیائے انسانیت کے لیے ہادی اور مصلح بنا کر بھیجے گئے تھے؛ لہٰذا شاہانِ عالم تک دعوت حق پہنچانے کے لیے آپ نے خطوط روانہ کیے، حبشہ کے بادشاہ نے اسلام قبول کر لیا، شہنشاہ ایران نے غصے سے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور خائب و خاسر ہوا، شاہ مصر نے شائستگی سے جواب دیا؛ جب کہ شاہ روم ابوسفیان سے مکالمے کے بعد صداقت کا قائل ہونے کے باوجود سلطنت کے چھن جانے کے خوف سے قبول حق نہیں کر سکا۔ جب کہ کئی رؤسائے عرب نے بھی اسلام کا کلمہ پڑھ لیا۔ ”یہ وقت تھا کہ اسلام کی قوت خاص قبائل عرب میں بھی مستحکم نہ ہوئی تھی، اندرونی اور بیرونی دشمن پیچھے لگے ہوئے تھے، ایسی حالت میں زبردست بادشاہوں پر کیا اثر پڑ سکتا تھا؟ کون سا عقل کا دشمن ہے جو یہ کہے کہ آپ نے شاہان دنیا سے قوت اور شوکت کی بنیاد پر مراسلت کی تھی، یا آپ کے پاس ایسا ظاہری ساز و سامان تھا جس کو دیکھ کر کسی بادشاہ پر رعب پڑتا؟ نہیں؛ بلکہ آپ کو حکم تھا کہ حق کا پیام سب کو پہنچا دو، آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور سب کے پاس قریب قریب ایک ہی مضمون کے خط بھیج دیے، خطوط کا مضمون گو بالکل سادہ اور نہایت مختصر تھا؛ مگر اس کے اندر روحانی قوت مضمر تھی جس کی وجہ سے وہ قلوب جن کو حق و ناحق کی تمیز اور صادق و کاذب کے ادراک کا مادہ تھا؛ بغیر مرعوب و متاثر ہوئے نہیں رہ سکتے تھے۔“ [1]

[1] اشاعت اسلام ۱/ ۷۰

بعض مخالفین کا اعتراف حقیقت

اب اس باب میں خود بعض مستشرقین و ہندو مؤرخین کے اعترافات پر اس مضمون کو ختم کیا جارہا ہے: برطانوی مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ اپنی کتاب Muhammad western attempt to understanding Islam میں حقیقی صورت حال کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ایسے مذہب اور تہذیب کے بانی تھے جس کی بنیاد تلوار پر نہ تھی، مغربی پروپیگنڈے اور افسانہ کے باوجود اسلام کا نام امن اور صلح کا مفہوم رکھنے والا ہے۔'' [۱]

آرتھر گلیمن فتح مکہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح درحقیقت دنیا کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انھوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو مٹا ڈالا اور ظالمانہ نظام سلطنت کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔'' [۲]

بی ایس رندھاوا ہوشیار پوری لکھتے ہیں:

کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام کو ایک خون خوار اور بے رحم انسان دکھایا جائے اور خواہ مخواہ دوسروں کو ان سے نفرت دلائی جائے، اس کا بڑا سبب یہ ہوا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائف پر تنقید کرنے والوں نے اسلامی تاریخ اور بانی اسلام کی صحیح سیرت کا مطالعہ کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی؛ بلکہ سنی سنائی اور بے بنیاد باتوں کو سرمایہ بنا کر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی۔ [۳]

ایک اور ہندو مفکر راجندر نرائن نے لکھا ہے:

''سب سے جارحانہ پروپیگنڈہ یہ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اگر ایسا نہیں ہے تو دنیا میں متعدد مذاہب کے ہوتے ہوئے اسلام ہی معجزاتی طور پر دنیا بھر میں کیسے پھیل گیا؟ اس سوال یا شبہ کا مختصر اُجواب یہ ہے کہ جس زمانے میں اسلام کے

[۱] دیکھیے کتاب مذکور کا ص ۲۶۶

[۲] lihad.com

[۳] رسالہ مولوی ربیع الاول ۱۳۵۱ھ

اس نئے ایڈیشن کی اشاعت ہوئی، سابقہ دھرموں کے بے کردار، پیروکاروں نے دھرم کو بھی بھرشٹ کر دیا تھا؛ اس لیے انسانی فلاح کی خاطر اللہ کی مرضی کے مطابق اسلام کامیاب ہوا اور دنیا بھر میں پھیلا، تاریخ اس کی گواہ ہے۔" [1]

غرض یہ کہ یہ امر بالکل واضح ہے کہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت گیری اور تلوار کے زور پر جہاں بانی کا الزام محض حقائق سے لاعلمی یا تعصب وعناد پر مبنی ہے۔ قرآن مقدس، دلائل عقلیہ اور تاریخی شواہد بہ جبر واکراہ کسی کو مسلمان بنانے کی سختی سے نفی کرتے ہیں۔ جہاد کا مقصد بھی شر وفساد کا خاتمہ، عدل وانصاف کا راج قائم کرنا، ہر شخص کو قبول حق کی آزادی فراہم کرنا اور اس راہ کے روڑے کو ہٹانا ہے۔ اشاعت اسلام کے لیے دعوت، مصالحت، ہجرت اور مکاتبت کی راہ اپنائی گئی ہے، شمشیر وسنان کے زور پر دلوں کو فتح نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اپنی ذاتی خوبیوں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق، مطابق فطرت بلند پایہ تعلیمات، ہمدردی ومساوات اور اعلیٰ کردار سے پھیلا ہے۔ تلوار کے زور سے نہیں۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِـُٔوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ ۝ [2]

''یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں؛ حالاں کہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں۔''

---

[1] سہ روزہ دعوت دہلی، ۲۸ر جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۲۰

[2] الصف: ۸

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد نکاح اور مستشرقین کے بے جا اعتراضات

رحمت عالم، پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر مستشرقین ومخالفین نے طعن وتشنیع اور افتراءات واتہامات کے جو تیر چلائے ہیں اور آپ کی معصوم شخصیت اور پاکیزہ کردار سے دنیا کو متنفر کرنے کے لیے شکوک واعتراضات کی جو منصوبہ بند مہم چھیڑ رکھی ہے؛ ان میں سے ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک دو نہیں؛ بلکہ گیارہ نکاح کیے اور نعوذ باللہ آپ مغلوب الشہوہ تھے اور ہمہ وقت اسی طرح کی چیزوں میں مستغرق رہتے تھے، ظاہر ہے ایک ایسا پیغمبر جس نے دنیا کو عفت وعصمت اور شرم وحیا کا سبق پڑھایا اور اعلیٰ اخلاق واقدار کا حامل صالح معاشرہ تشکیل دیا، ہزار جتن کے باوجود مکہ کے کفار ومعاندین اور مدینہ کے یہود ومنافقین کو جس کے کردار پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکا؛ مستشرقین ومخالفین ایسی بلند کردار شخصیت میں بھی کیڑے نکالنے سے محض خبث باطن اور تعصب وعناد کی وجہ سے باز نہ رہ سکے۔

مستشرقین کے گستاخانہ تبصرے

چنانچہ فرانسیسی مستشرق مکسیم روڈنسن کہتا ہے:

"كان من سوء الحظ أن شعر تجاه خديجة بالعاطفة الطبيعية التي أرواها بعدما تقدمت به السن مع النساء الشابات والمحبوبات في حريمه." [1]

"یہ بدقسمتی کی بات تھی کہ محمد کو خدیجہ سے ساتھ فطری، پیار محسوس ہوا، جس کو انھوں

---

[1] محمد، ص ۵۱

نے اپنے حرم کی جوان اور محبوب خواتین کے ساتھ بڑھاپے کے بعد بیان کیا"
جب کہ عیسائی پادری ڈاکٹر جیری نے کلیسا کی مذہبی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہوت پرست قرار دیا اور کہا:

"الرسول کان یتحرش بالأطفال وتزوج اثنتی عشرۃ زوجة" [1]

"یہ شخص جن کو مسلمان پیغمبر مانتے ہیں بچوں کے ساتھ بدتمیزی کرتے تھے اور بارہ خواتین سے انھوں نے شادی کر رکھی تھی"۔

اس طرح کے دسیوں اوچھے الزامات اور بے ہودہ تعبیرات سے مستشرقین کی تحریریں بھری پڑی ہیں، جنھیں نوک قلم پر بھی نہیں لایا جاسکتا، ان کی جرأت گستاخانہ اور صورت حال کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے مذکورہ بالا دو اقتباسات "نقل کفر کفر نباشد" کے احساس کے ساتھ بادل ناخواستہ نقل کر دیے گئے ہیں۔

سب سے پہلے تو مخالفین کے حلق سے یہی نہیں اتر رہا ہے کہ اسلام میں مرد کو ایک سے زائد چار عورتوں سے بہ یک وقت نکاح کی اجازت کیوں دی گئی ہے، یہ تو عورت پر ظلم اور گھریلو زندگی میں پیچیدگی کا سبب ہے۔ ثانیاً یہ کہ اگر چار تک کی اجازت ہے تو رسول مطہر صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سے زائد گیارہ نکاح کیوں کیے۔

اس مختصر مضمون میں انھیں دو سوالوں کے جواب دے کر حقیقت حال واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اسلام اور تعدد ازواج

اسلام ایک ہمہ گیر دین فطرت ہے، اس نے فطری جذبات کی رعایت کرتے ہوئے، حرام کاری سے حفاظت اور افزائش نسل کے صالح مقاصد کے لیے نکاح کا حکم دیا ہے اور اس کو میاں بیوی کے درمیان مودت ورحمت اور ایک دوسرے کے لیے تسکین قلب کا سامان فراہم ہونے کا ذریعہ قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَ

[1] معجم افتراءات الغرب علی الاسلام، ص ۱۰۱

بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ①

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں تعدد ازدواج یعنی ایک ہی وقت میں ایک سے زائد بیویاں اور چار تک کی محدود تعداد کے ساتھ تفصیلات کے ساتھ اجازت دی گئی ہے، اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ②

"اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے، لیکن اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو یا جو لونڈی تمہاری ملک میں ہو، وہی سہی، اس میں امید ہے کہ تم ایک طرف نہ جھک پڑو گے۔"

تعدد ازدواج کی شرائط و قیود

لیکن تعدد ازدواج کی اجازت غیر محدود اور علی الاطلاق نہیں ہے؛ بلکہ نصوص کی روشنی میں چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

۱- مسلمان مرد کے لیے ایک وقت میں چار بیویوں تک کی ہی اجازت ہے۔ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اس پر پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے۔

۲- تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کے لیے بیویوں کے حقوق کی ادائیگی

---

① سورۃ الروم: ۲۱

② سورۃ النساء: ۳

پر قدرت کا ہونا بھی ضروری ہے، لہٰذا جو شخص ایک سے زائد بیوی کے مہر اور دیگر اخراجات کا
متحمل نہیں ہو سکتا، اس کے لیے تعدد کی اجازت نہیں ہے اور اگر ایک کا بھی خرچ نہیں اٹھا سکتا ہے، تو مالی
استطاعت ہونے تک وہ ایک نکاح سے بھی باز رہے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ [1]

"اور ایسے لوگوں کو کہ جن میں نکاح کا مقدور نہیں ان کو چاہیے کہ ضبط کریں یہاں تک
کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کردیں۔"

جہاں ایک سے زائد خواتین سے نکاح کی صورت میں ان کے درمیان عدل اور برابری
بھی ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ پاک نے جہاں تعدد کی اجازت دی ہے، وہیں یہ بھی
ارشاد فرمایا ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً [2]

"اگر تم کو احتمال ہو کہ عدل نہ رکھ سکو گے تو ایک ہی بیوی پر بس کرو"

اور اس عدل کا مطلب یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان نان ونفقہ، رہائش، لباس،
پوشاک، بستر اور ان تمام مادی امور میں مساوات ضروری ہے جو شوہر کے بس میں ہیں۔
جہاں تک تعلق ہے اندرونی لگاؤ اور دلی محبت کا، تو یہ اس کے اختیار سے باہر کی چیز ہے، وہ
اس میں برابری کا مکلف نہیں ہے۔

فحاشی اور بے راہ روی کا جائز متبادل

مرد وزن میں مساوات کا نعرہ دے کر جو لوگ مرد کے لیے ایک سے زائد نکاح پر
اعتراض کرتے ہیں وہ یا تو حقائق کو جانتے نہیں، یا جان بوجھ کر ان سے آنکھیں موند لیتے
ہیں، عام اندازے کے مطابق لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہے، تو کیا تعدد پر
قدغن لگا کر لڑکیوں کی ایک تعداد کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے کہ ان کے ساتھ
ناجائز تعلقات قائم کر کے فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دیا جائے؟ اور بیوی کی حیثیت سے

[1] سورۃ النور: ۳۳
[2] سورۃ النساء: ۳

باعزت زندگی گزارنے کا حق ان سے چھین لیا جائے؟ یادرکھیے! اسلام کی نظر میں زنا اور بدکاری انتہائی قبیح عمل ہے اور اس کے ناسور سے معاشرے کو پاک رکھنے کی اسلام بہت زیادہ کوشش کرتا اور اس کے مرتکب کے لیے انتہائی سخت سزا تجویز کرتا ہے۔ اس لیے اس طرح کی بے راہ روی سے حفاظت اور فطری جذبات کی جائز طریقے پر تسکین کے لیے نکاح اور متعدد نکاح کی اجازت دے رکھی ہے۔

متعدد نکاح کے جواز کے اسباب اور حکمتیں

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسئلے کا سنجیدگی اور معروضیت کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ گہرائی کے ساتھ غور وفکر کے نتیجے میں واضح طور پر تعدد ازواج کی حکمتیں اور اسباب سمجھ میں آجاتے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱-عورت کی حفاظت اور اس کے وقار کا خیال

ایک سے زائد نکاح کی اجازت میں عورت کا مفاد ہے؛ اس لیے کہ عموماً عورتوں کی تعداد، مردوں کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے اور قانون قدرت نہیں چاہتا کہ عورتوں کی ایک تعداد کنواری ہی رہ جائے؛ جب کہ کوئی بھی عورت اپنی فطری ضروریات کی تکمیل کے لیے مرد سے مستغنی نہیں ہوسکتی ہے اور جیسے ہر مرد کو شوہر اور باپ بننے کا حق ہے، اسی طرح ہر عورت کو بھی بیوی اور ماں بننے کا حق ہے اور تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں تعدد کی اجازت کے بغیر ہر عورت کو اس کا یہ حق نہیں دیا جاسکتا ہے۔

۲-حالت مرض میں نگہداشت

کبھی بیوی کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے اور شوہر کو ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسری شادی کرنی ہی پڑتی ہے، تو پہلی خود بھی طلاق لینے کے بجائے اسی کی زوجیت میں رہنے کو پسند کرتی ہے؛ کیوں کہ شوہر اس کے بھی نان ونفقہ اور رہائش کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اور کبھی عورت شوہر کے قابل نہ رہ جانے کے باوجود اس کے ساتھ قلبی تعلق اور دیرینہ محبت کی وجہ سے اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی اور سوکن کو برداشت کرنا آسان معلوم ہوتا

۲۔ تو اس کی فطری محبت کی رعایت بھی اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ اسے بھی شوہر کی زوجیت میں رہنے دیا جائے۔

۳۔ حصول اولاد کی خواہش کی تکمیل

انسان کو فطری طور سے اولاد کی بے پناہ چاہت ہوتی ہے اور بعض مرتبہ عورت کے بانجھ پن کی وجہ سے اسے دوسری شادی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اب ایک شکل تو یہ ہے کہ اس کو کہا جائے کہ تم اپنی پہلی بانجھ بیوی کو طلاق دو، تب ہی دوسری شادی کر سکتے ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو نکاح میں باقی رکھتے ہوئے اور اس کے حقوق کی ادائیگی بھی شوہر پر لازم رکھتے ہوئے اسے دوسری کی اجازت دی جائے۔ شریعت عورت کے ساتھ فطری ہمدردی اور طلاق کو ناپسندیدہ قرار دینے کی وجہ سے دوسری صورت کو ترجیح دیتی ہے۔

۴۔ عورتوں کا تعاون

بعض دفعہ کوئی خاتون بیوہ ہو جاتی ہے، جس کے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہوتے ہیں، یا مرد کی غیر محرم قریبی رشتہ دار خاتون ہوتی ہے اور یہ مرد پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے ایسی خاتون سے نکاح کر کے اس کے اور اس کے بچوں کی کفالت کا ذمہ دار اور باعزت زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔

۵۔ مرد و عورت میں فطری تفاوت کی رعایت

مرد کی تولید کی صلاحیت بسا اوقات ستر اسّی سال کی عمر ہو جانے کے باوجود باقی رہتی ہے، جب کہ خواتین پچاس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں افزائش نسل جو ایک محمود مقصد ہے؛ کی تکمیل کے لیے تعدد کی اجازت کے سوا اور کیا شکل رہ جاتی ہے؟

۶۔ مرد کی جنسی طاقت کی رعایت

اللہ رب العزت نے بعض مردوں کو زبردست جنسی طاقت عطا کر رکھی ہے اور عورتوں پر بعض مراحل ایسے آتے ہیں جن میں جنسی تعلقات قائم نہیں کیے جا سکتے، مثلاً حیض، نفاس

اور بعض ایام حمل، تو ان صورتوں میں مرد کو حرام کاری سے بچانے کے لیے شریعت نے دوسرے نکاح کی شکل میں جائز راہ عمل فراہم کر دی ہے۔

۷- کوئی محروم نہ رہے

اسلام نے تمام خواتین کے لیے توازن اور عدل کا نظام قائم کر رکھا ہے، اس لیے کوئی ایسی عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو جائے، یا وہ مطلقہ ہو جائے یا خاصی عمر گزر گئی اور اب تک اس کی شادی نہ ہو سکی۔ ایسی عورت کو بھی محرومی سے بچانے کا نظام کر دیا گیا ہے کہ اگر معاشرے کے نوجوان اس کو پہلی بیوی کے طور پر اپنانے سے گریز کریں تو شادی شدہ لوگ آگے بڑھ کر اپنی زوجیت میں لے کر ذمہ داری کا ثبوت دیں اور کسی بھی خاتون کو تنہائی اور ذلت کی آگ میں نہ جھلنے دیں۔

۸- رشتہ داری اور ارتباط کے دائرے کی وسعت

تعدد ازدواج دعوتی، رفاہی اور سماجی خدمات کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے قرابت اور ارتباط کا دائرہ وسیع ہوتا ہے؛ اس لیے سسرالی رشتے کو بھی اللہ رب العزت نے مقام امتنان میں ذکر کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ؕ وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۝ [1]

''اور وہی ایسا ہے جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا اور تیرا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔''

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ باپ دادا وغیرہ شرعی خاندان اور ماں نانی وغیرہ عرفی خاندان ہیں جن سے پیدائش کے ساتھ ہی تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر شادی کے بعد سسرالی کے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں، یہ دلیل قدرت بھی ہے کہ نطفہ کیا چیز تھی پھر اُس کو کیسا بنا دیا کہ وہ اتنے علاقوں والا ہو گیا اور نعمت بھی ہے کہ یہ تعلقات مدارِ معاونت ہیں۔'' [2]

---

[1] الفرقان: ۵۴ [2] ترجمہ وتفسیر بیان القرآن، ص ۷۱۹

تعدد ازواج کی یہ چند حکمتیں اور اسباب ذکر کر دیے گئے، کھلے ذہن کے ساتھ غور وفکر سے یہی نہیں؛ بلکہ ہر حکم ربانی اور قانون خداوندی میں مخفی مصلحتیں اس طرح آشکارا ہوجاتی ہیں کہ عقل سلیم رکھنے والے خود ہی مکمل انشراح کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

غور وفکر کا ایک اہم پہلو

یہاں اس امر پر بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ مخالفین نے اس طرح پروپیگنڈا کر رکھا ہے جیسے ہر مسلمان نے ایک سے زائد نکاح کر رکھا ہو اور یہ اسلام کا ایسا حکم ہو جس کی بجا آوری ہر حال میں ضروری ہو، جب کہ عملی صورت حال خاص کر برصغیر میں یہ ہے کہ تعدد نکاح کے واقعات شاذ ونادر ہی پیش آتے ہیں اور مسلمانوں کا معاشرتی مزاج بھی عام طور سے اس کو قبول نہ کرنے کا ہے۔ مخالفین کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت مطہرہ نے بہ وقت ضرورت تعدد کی اجازت دی ہے؛ لیکن تعدد ازواج شریعت کی طرف سے ایسا لازمی حکم نہیں ہے کہ ہر مسلمان کو ایک سے زائد نکاح کرنا ہی ہوگا اور اس کے لیے بھی اس عورت کی رضامندی ضروری ہے جس سے نکاح ہو رہا ہے اور اگر پہلی خاتون یہ محسوس کرے کہ شوہر واقعی اس کی حق تلفی کر رہا ہے تو وہ اس کو عدالت میں گھسیٹ سکتی ہے اور برابری کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

اسلام نے تعدد ازواج کے تصور کی اصلاح کی ہے

تعدد ازواج کا تصور اسلام کی ایجاد اور کوئی نیا تصور نہیں ہے؛ بلکہ دنیا کی بیش تر اقوام وملل میں صدیوں اس کا تصور رہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے بیک وقت دس دس خواتین سے نکاح کر رکھا تھا: بعض انبیاء سابقین علیہم السلام کے حرم میں کئی کئی خواتین رہی ہیں۔ ہندوؤں کی بعض نمایاں مذہبی شخصیات کے یہاں بیک وقت سو سے بھی زائد خواتین رہتی تھیں (کچھ تفصیلات آگے آرہی ہیں)

اسلام نے معاشرتی ضرورت کے پیش نظر بالکلیہ اس پر پابندی عائد نہیں کی؛ البتہ اس کی تطہیر، چار تک تحدید اور شرائط وضوابط کی تعیین کر کے بے راہ روی اور عورتوں کی حق تلفی پر قدغن ضرور لگا دیا ہے۔

مغرب کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کا امتیاز

مغرب جس نے اسلام کے تعدد ازدواج کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے اور اپنی تہذیب و معاشرت پر حد درجہ نازاں ہے؛ ایسا نہیں ہے کہ اس کے یہاں تعدد زوجات بالکل ممنوع ہے؛ بلکہ مغربی معاشرے میں ایک مرد کا متعدد عورتوں کے ساتھ تعلق عام سی بات ہے اور اس کو جرم بھی خیال نہیں کیا جاتا ہے۔

درج ذیل نکات کے ذریعے تعدد کے سلسلے میں دونوں معاشرے کے فرق کو واضح کیا جاسکتا ہے:

● اسلام میں ایسی عورت کو زوجہ اور بیوی کا نام دیا جاتا ہے جب کہ مغربی معاشرے میں اس کو دوست اور گرل فرینڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

● اسلام میں ایک سے زائد نکاح علانیہ طور پر ہوتا ہے جب کہ مغرب میں خفیہ طریقے پر ایک سے زائد عورتوں کے ساتھ تعلقات بنائے جاتے ہیں۔

● اسلامی معاشرے میں یہ عمل شرعی اور قانونی طریقے پر انجام پاتا ہے؛ جب کہ مغربی معاشرے میں حرام اور غیر قانونی طریقے پر انجام دیا جاتا ہے۔

● اسلامی معاشرے میں یہ اجازت چار عورتوں تک محدود ہے؛ جب کہ مغربی معاشرے میں عورتوں کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے۔

● اسلامی معاشرے میں یہ تعداد عورتوں کے ساتھ مختص ہے؛ جب کہ مغرب میں یہ مرد وعورت دونوں کو شامل ہے۔ یعنی ایک خاتون کے بھی متعدد مرد دوست اور بوائے فرینڈ ہوسکتے ہیں۔

● اسلام میں اس تعدد کا ایک خاص نظام ہے اور یہ نظام بیویوں اور ان کی اولاد کے حقوق کی ضمانت لیتا ہے؛ جب کہ مغربی معاشرے میں اس کا کوئی خاص نظام اور ضابطہ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے انتشار پھیلتا ہے۔ ان خواتین اور ان کے بطن سے جنم لینے والی اولاد کی حق تلفی ہوتی ہے۔ [1]

---

[1] تعدد الزوجات فی الاسلام، د۔ عبدالجبار فتی زیدان، شبکۃ الالوکۃ

تعدد ازدواجات کے تعلق سے معاصر دنیا کا رویہ

اس وقت چند ممالک میں ایک سے زائد بیوی کی قانونی اجازت ہے اور بعض ممالک میں قانونی اجازت نہ ہونے کے باوجود لوگ یہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں، چند اور ممالک میں شادیاں کم اور محض جنسی پارٹنرشپ کا رواج عام ہو چکا ہے۔ جنوبی افریقہ کے صدر جیک زوما چار بیویوں کے شوہر ہیں اور وہاں کے قبائلی قانون اس کی اجازت دیتے ہیں۔ فرانس کے آں جہانی صدر فرانکوئس متران کی دوسری غیر سرکاری بیوی کا راز اس وقت فاش ہوا جب ان کی دوسری بیوہ پہلی بیوی کی موجودگی میں جنازے میں شرکت کے لیے آئیں۔ انسائیکلوپیڈیا بیبلیکا کے مطابق ''ایک عام یہودی کو چار شادیاں کرنے کی اجازت تھی'' ۱۹۵۰ء میں یہودیوں کے چیف ربّی نے ایک سے زیادہ شادی کی عام ممانعت کردی؛ تاہم اب بھی یہودیوں میں کسی نہ کسی شکل میں یہ رائج ہے۔ اسی طرح امریکہ میں مارمان کرسچین فرقہ میں اب تک کئی خواتین سے بیک وقت شادیوں کا رواج چلا آرہا ہے۔ اس عیسائی فرقے کے بیش تر پیروکار یوٹاہ اور وائیومنگ وغیرہ ریاستوں میں رہتے ہیں۔ اسی طرح آفرو ایشین چرچ کے پادری بھی کثیر زوجیت کو خواتین سے بے وفائی، زنا کاری اور بیویوں کے تبادلے جیسی قبیح برائیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ہندو میرج ایکٹ کے منظور کیے جانے تک ہندوؤں پر شادی کے سلسلے میں کوئی تحدید نہیں تھی۔ اس ایکٹ نے پہلی بار ایک سے زائد شادی کو غیر قانونی قرار دیا، تاہم ہندوؤں کی مقدس کتابوں کی رو سے یہ اب بھی غیر قانونی نہیں ہے؛ لہٰذا یک زوجگی کا دعویٰ محض ملمع کاری ہے اور اسلام اور مسلمانوں پر متعدد شادیوں کا الزام اپنے منافقانہ طرز عمل کی پردہ پوشی ہے'' (فکر و خبر ڈاٹ کام)

خلاصہ یہ کہ تعدد ازدواج کا قانون فطرت سے ہم آہنگ، عورتوں کو تحفظ اور مردوں کو عفت بخشنے اور آوارگی وفحاشی سے بچانے والا صدیوں سے چلا آرہا قانون ہے۔ اس کے تناظر میں مسلمان اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا تعصب وجہل پر مبنی ہے اور اس الزام کو میڈیا میں بڑھا چڑھا کر اس انداز سے پیش کرنے سے بھی ہوا ملی ہے کہ ایک سے زائد نکاح ہر مسلمان کے لیے لازمی حکم ہے اور مسلمان فطری طور سے ہی شہوت پرست ہوتا ہے۔

مرد کی طرح عورت کو چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں؟

مرد و عورت کے درمیان مساوات کے نعرے کے تناظر میں یہ سوال بھی بڑے زور و شور کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے کہ شریعت میں اگر مردوں کو چار بیویوں کی اجازت ہے تو عورت کو بہ یک وقت چار شوہر کی اجازت کیوں نہیں ہے؟

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام میں؛ بلکہ ہر مہذب سماج میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور خاندان کا مدار نسب کے تحفظ پر ہے؛ اس لیے کہ اگر نسب ہی معلوم نہ ہو تو رشتوں کا تعین ہی نہیں ہو سکے گا جس سے خاندان بنتا ہے اور ظاہر ہے کہ عورت اگر ایک مرد سے زیادہ کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرے گی تو پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا تعین انتہائی پیچیدہ ہو جائے گا۔ جاہلیت میں جب بدکاری عام تھی، اس مسئلے کا حل یہ نکال رکھا تھا جیسا کہ بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت اپنے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے والے سارے مردوں کو اکٹھا کر کے ان میں سے کسی ایک کو کہہ دیتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اور اسے بچے کی ذمہ داری قبول کرنی پڑتی تھی۔ یا بعض وقت قیافہ شناس کی مدد لی جاتی تھی۔ آج کل مغرب نے "سنگل پیرنٹ" کا قانون بنا کر بچے کی ذمہ داری کے سلسلے میں ماں کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ جو عورت پر صریح ظلم ہونے کے ساتھ فیملی سسٹم کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔

اور نسب متعین نہ ہونے کی صورت میں خود اس بچے کی خوراک، پوشاک اور تعلیم کے بھاری بھرکم اخراجات اور شفقت و تربیت کا ذمہ کون لے گا؟ تنازع کی صورت میں بے چاری ماں کو ہی سب کچھ سہنا پڑے گا۔

نفسیاتی اعتبار سے عورت کی فطرت میں محکومیت اور مرد کی فطرت میں حاکمیت کا عنصر پایا جاتا ہے؛ اس لیے کئی عورتیں ایک مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے خوش گوار زندگی گزار سکتی ہیں؛ لیکن ایک عورت ایک سے زائد حاکم اور نگراں کے اس پر مسلط ہونے کی صورت میں ہمیشہ ڈپریشن کا شکار رہے گی اور اس کا سکون غارت ہو جائے گا۔

شادی کا ایک اہم مقصد اولاد کا حصول اور نسل کی افزائش ہے۔ ایک مرد کے نکاح میں چار عورتوں کے ہونے سے یہ مقصد بدرجۂ اتم حاصل ہوتا ہے جب کہ ایک عورت کی

چار مردوں سے شادی میں افزائش نسل میں کوئی تیزی نہیں آتی ہے۔(al.Islam.org)
طبی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ایڈز اور سرطان رحم کا بنیادی سبب جنسی آوارگی پر مبنی انتشار ہے، عورت کے رحم میں مختلف لوگوں کے مادہ منویہ کا جمع ہونا عورت کے اندر ایڈز اور سرطان رحم کا شدید خطرہ پیدا کرتا ہے۔"(parhlo.com)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاح

اس مختصر تفصیل کے بعد زیر بحث اصل مسئلے سے متعلق حقائق پیش کرتے ہیں، مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شہوت پرستی کا جو بے بنیاد الزام عائد کیا ہے، اس میں اسلام کے اسی عام حکم کو زینہ بنایا ہے کہ جب عامۃ المسلمین کے لیے حسب ضابطہ چار کی ہی گنجائش ہے تو آخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ نکاح کیوں کیا؟ کیا یہ شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

چنانچہ کل گیارہ ازواج مطہرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں آئیں۔ جن میں سے دو یعنی حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہما، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی آخرت کو سدھار گئیں۔ جب کہ نو یعنی امہات المومنین عائشہ، حفصہ، ام حبیبہ، ام سلمہ، سودہ، زینب بنت جحش، میمونہ، جویریہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن آپ کی وفات کے وقت بھی بہ قید حیات تھیں۔" [1]

چار سے زیادہ کی اجازت

بعض جدید افکار وخیالات کے حامل مسلمانوں کو بھی یہ خلجان پریشان کرتا ہے اور رسول مطہر صلی اللہ علیہ وسلم کے چار سے زائد متعدد نکاح کی تشریعی حیثیت کے تعلق سے وہ بھی شکوک وشبہات کی وادیوں میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔

اس لیے سب سے پہلے اسی شبہے کا دفعیہ کیا جائے گا۔ اس شبہے کے ازالے کے لیے ہمیں تین اہم نکات ضرور سامنے رکھنا چاہیے:

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۲/ ۶۴۳-۶۸۴

(۱) وحی اور شریعت کے عین مطابق عمل

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل عین مطابق وحی، مرضی رب کی نمائندگی اور حکم خداوندی کی شرح وتبیین ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کی طرف سے تنہا آپ ہی شریعت مطہرہ کے مبلغ اور شارح ہیں۔ آپ ہی کے واسطے سے دین کا علم ہوتا ہے اور تنہا آپ ہی کو اللہ پاک نے اقوال وافعال کے اعتبار سے معصوم قرار دیا ہے؛ لہٰذا کسی بھی حکم کو شریعت اسلامی کے مخالف قرار دینا شرعاً بھی باطل ہے اور عقلاً بھی؛ اس لیے کہ شریعت اور وحی تو صرف آپ پر نازل ہوئی، تو اس معترض کو کیا وحی کے علاوہ کسی اور طریقے سے پتہ چلا کہ فلاں چیز عین شریعت ہے اور فلاں چیز مخالف شریعت؟

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی عام انسان نہیں؛ بلکہ اللہ کے سب سے منتخب بندے اور پیغمبر ورسول ہیں۔ آپ پر جس طرح ایسی ذمہ داریاں اور فرائض عائد کیے گئے ہیں جو عام افراد امت سے مختلف ہیں۔ اسی طرح آپ کو ایسی منزلت اور خصوصیات عطا کی گئی جو اوروں کو نصیب نہ ہوسکیں: مثلاً تہجد اور قیام اللیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض ہے، امت پر نہیں۔ زکاۃ وصدقات کا استعمال آپ کے لیے اور آپ کی اولاد کے لیے حرام قرار دیا گیا، جب کہ دوسروں کے لیے اس کی اجازت ہے۔ تو انھیں خصوصی احکام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک ہی وقت میں چار سے زائد خواتین سے نکاح کی اجازت ہے، جس میں کئی دینی وشرعی مصلحتیں مضمر ہیں۔

(۳) اللہ کی اجازت اور ازواج کی مرضی سے سارے نکاح ہوئے

اللہ رب العزت نے صراحت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چار سے زائد نکاح کو مباح قرار دے کر قرآن کریم میں اس کا اعلان فرمادیا ہے، تو کیا اس کے بعد بھی اس کو خلاف شرع اور نقص وعیب کا باعث قرار دینے کا کوئی جواز رہ جاتا ہے؟ ارشاد باری ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ
يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَ
بَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا
لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ
الْمُؤْمِنِينَ ۔ [1]

اے نبی ہم نے آپ کے لیے آپ کی بیویاں حلال کر دی ہیں جنہیں آپ ان کے مہر دے چکے
ہیں اور وہ عورتیں بھی جو تمہاری ملکیت میں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو
غنیمت میں دلوا دی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں
اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے آپ
کے ساتھ ہجرت کی ہو اور اس مسلمان عورت کو بھی جو بلا عوض اپنے آپ کو پیغمبر کو دے
دے بشرطیکہ پیغمبر اس سے نکاح کرنا چاہیں یہ حکم صرف آپ کے لیے خصوصی ہے
نہ کہ دوسرے مومنوں کے لیے۔

اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ
حالات تھے ان ازواج مطہرات کی طرف سے بھی نفقہ اور سہولیات کا مطالبہ ہوتے
تھے ان میں سے بعض کی کیا یہ خواہش تھی کہ جس سے محسوس ہوتا کہ وہ اس بات پر
آمادہ نہیں ہیں کہ تنگی کی زندگی بسر کریں حالانکہ وہ تو اس رشتے کو اپنے
لیے ایک عزت سمجھتی تھیں اور یہ واقعہ بھی پیش آئے کے بعد جب اللہ رب
العزت کی طرف سے تخییر کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت
کے حوالے سے تخییر دیا اور کہا گیا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا
فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ

---

[1] الاحزاب ۵۰

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ [۱]

''اے نبی آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجیے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ متاع دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسول کو اور عالم آخرت کو تو تم میں سے نیک کرداروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔''

تو اس اختیار کے بعد بھی تمام ازواج مطہرات نے مکمل انشراح کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کو ہی منتخب کیا۔ [۲]

تو جب ان متعدد نکاح کو اللہ رب العزت نے مباح قرار دیا اور ساری بیویاں بھی پوری طرح رضامند تھیں، تو کسی اور کے لیے اس پر طعن یا اعتراض کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟

متعدد نکاح کے اسباب اور مصلحتیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ امر خداوندی جتنے نکاح کیے ہیں، سب میں زبردست مصلحتیں اور حکمتیں مخفی ہیں۔ کھلے ذہن کے ساتھ غور و فکر سے واضح ہوتا ہے کہ ان نکاحوں سے متعدد تعلیمی و تربیتی مفادات اور دینی مصالح وابستہ ہیں۔ ان میں سے بعض تو مشترکہ عمومی مفادات ہیں جو ساری ازواج سے متعلق ہیں اور بعض عمومی مفادات و منافع ہیں جو کسی خاص زوجہ سے متعلق ہیں اور اسی نوعیت کے بعض خاص مفادات ہیں۔ ذیل میں ان نکاحوں سے وابستہ تینوں طرح کے مفادات پر مختصر اروشنی ڈالی جارہی ہے:

مشترکہ عمومی مفادات و مصالح

چنانچہ ان نکاحوں سے وابستہ تمام ازواج کے درمیان مشترک عمومی مفادات میں ایک اہم مفاد یہ ہے کہ یہ امہات المومنین دیگر مومن عورتوں کے لیے معلمات و مربیات ثابت ہو سکیں، خاص کر عورتوں کے مخصوص مسائل میں جن میں انھیں حیا اور شرم محسوس ہوتی ہے۔

---

[۱] الاحزاب: ۲۸-۲۹ [۲] صحیح بخاری: ۴۴۱۲

دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنس کی تفریق کے بغیر سب کے لیے معلم بنا کر بھیجے گئے تھے؛ اس لیے آپ نے مہذب سماج کی تشکیل کے لیے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی خیال نہیں فرمایا؛ بلکہ عورتوں کی تربیت اور تعلیم کو بھی ضروری سمجھا؛ لیکن آپ کا لایا ہوا صالح نظام، فطری حیا اور شرعی ضابطہ مرد وعورت کے آزادانہ اختلاط کو ممنوع قرار دیتا ہے؛ اس لیے عورتوں کی تعلیم کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی یہی ایک شکل رہ گئی تھی کہ آپ کی زوجیت میں مختلف عمر، طبقات اور صلاحیتوں کی حامل خواتین آئیں اور ان کو تعلیم وتربیت دے کر اس لائق بنا دیں کہ وہ شہری، دیہاتی اور جوان وبوڑھی ہر قسم کی خواتین کو مثالی تربیت دیں اور آپ کے مشن کو آگے بڑھائیں؛ چنانچہ ان امہات المومنین سے امت کو بڑا علمی فیض پہنچا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور احادیث وآثار کا ایک بڑا ذخیرہ انھیں کا رہین منت ہے۔ بعد میں صحابۂ کرامؓ بھی اپنے لاینحل مسائل میں جب ان سے رجوع کرتے تو وہ مسائل حل ہوجایا کرتے تھے۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

”قد كان الصحابة يختلفون في الشيء فتروي لهم أمهات المومنين عن النبي صلى الله عليه وسلم شيئًا فيأخذون به ويرجعون إليه ويتركون ما عندهم له“ [1]

”صحابۂ کرامؓ کا کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا اور امہات المومنین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی روایت بیان کردیتیں تو صحابہ اس کو لے لیتے اور اس کی طرف رجوع کر لیتے اور اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے۔“

تو امہات المومنین چوں کہ خلوت نبوی کی رازدار اور آپ کی خانگی زندگی کی محرم اسرار تھیں، اس لیے خود قرآن کریم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے اندر جو علم ومعرفت اور حکم وحکمت سکھائی جاتی ہے، دوسروں تک منتقل کرنے کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے؛ چنانچہ ارشاد باری ہے:

---

[1] زاد المعاد ۵ / ۵۳۴

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ [1]

''اور تم ان آیات الٰہیہ کو اور اس علم کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ راز داں ہے پورا خبر دار ہے۔''

خواتین کے سر پر تاج عظمت

اسی طرح ان نکاحوں کی ایک مشترکہ عمومی مصلحت خواتین کی عظمت کا اظہار اور ان کی قدر و منزلت کا درس دینا ہے۔ اس وقت کے جاہلی معاشرے میں عورت کے صرف فرائض تھے حقوق نہیں، اسے صرف اپنے جنسی جذبات کی تسکین کا سامان اور وراثت میں منتقل ہونے والا مال، یا فقر، عار اور نحوست کا سبب خیال کیا جاتا تھا، ایسے معاشرتی ماحول میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خواتین سے نکاح فرما کر انھیں زبردست عزت و وقار بخشا، یہ سارے مومن مردوں کی مائیں کہلائیں اور امت کے تمام مرد و عورت کی معلمائیں بنیں اور ایسی شرافت و عظمت حاصل ہوئی جس پر کوئی بھی عورت فخر کر سکتی ہے۔

●●●

[1] الاحزاب: ۳۴

خاص خاص نکاح سے وابستہ
عمومی مصلحتیں اور مفادات

۱- تالیف قلب اور اسلام مخالف جذبات کا خاتمہ

نسب کی طرح سسرالی رشتے کی عربوں میں بڑی اہمیت تھی اور سخت دشمنی کے باوجود بھی عموماً اس کا پاس ولحاظ رکھا جاتا تھا۔ قبیلے، برادری اور خاندان کی عصبیت نے بھی بہت سوں کو دین حق سے دور کر رکھا تھا اور ان جاہلی بیماریوں کے علاج کی بھی حکمت ورافت کے ساتھ سخت ضرورت تھی؛ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان نکاحوں نے بھی بہت سے اشخاص اور قبائل کے دلوں پر لگے نفرت کے تالوں کے لیے شاہ کلید کا کام کیا۔ مثلاً ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے نکاح نے کفر کی مشترکہ طاقت کے سالار اعظم اور نمایاں ترین مخالف ابوسفیان کی نفرت وعداوت کی تلوار کو بہ تدریج کند کرنے میں خاص کردار ادا کیا؛ چنانچہ آیت کریمہ "عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً" [۱] "اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری عداوت ہے دوستی کر دے"۔

میں مودت اور محبت کا مصداق بعض مفسرین نے ام حبیبہ سے نکاح کو ہی قرار دیا ہے جس کی وجہ سے ابوسفیان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں نرم گوشہ ہو گئے تھے۔ [۲]

اور خود ابوسفیان کو جب اس نکاح کا علم ہوا تو انھوں نے بڑے اعزاز کے ساتھ کہا تھا:

---

[۱] الممتحنۃ: ۷

[۲] دیکھیے ابن کثیر ۸ / ۹۰

"هو الفَحلُ لا يُقدَعُ انفهٗ." [1]

''وہ ایسا نر (باعزت شوہر) ہے جس کو (نکاح سے روکنے کے لیے) ناک پر مارا نہیں جاسکتا''

دراصل جب کمزور اونٹ بہت عمدہ اونٹنی سے جفتی کا ارادہ کرتا ہے تو لوگ اس کی ناک پر مار کر الگ کردیتے ہیں اور جب اس کے خلاف ہو تو یہ محاورہ بولتے ہیں، ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ عبیداللہ بن جحش کے نکاح میں تھی، دونوں مسلمان تھے اور حبشہ کی طرف دونوں نے ہجرت کی؛ مگر اتفاق سے عبیداللہ نے عیسائیت کو قبول کرلیا تو ام حبیبہ کا معاملہ مشکل میں پڑ گیا؛ اگر وہ مکہ واپس آتیں تو سارا خاندان مشرک تھا، ایمان کی حفاظت مشکل ہوتی، تو حضرت نجاشیؒ نے ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کردیا۔ اس پر ابوسفیان نے اس محاورے سے خوشی کا اظہار کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اعتراف بھی، یہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔ بعض نے اس کا مطلب بتایا ہے: محمدؐ ایک معزز انسان ہیں، جن کی عزت کو داغ دار نہیں کیا جاسکتا، یا یہ کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقابل شکست اور مستحکم ہونے کی طرف اشارہ تھا۔

اسی طرح بنوالمصطلق کے سردار کی بیٹی حضرت جویریہؓ جب حبالۂ عقد میں آئیں تو ایسے حالات بنے کہ وہ قبیلہ جو مسلمانوں سے برسرپیکار تھا، برضا و رغبت اسلام کے جانثاروں میں شامل ہوگیا۔ [2]

اسی طرح حضرت میمونہؓ سے نکاح کی وجہ سے نجد کے علاقے میں اسلام اور صلح کی راہیں ہموار ہوئیں۔

۲-تشریعی حکمتیں

انھی مصالح اور مفادات میں بعض تشریعی حکمتیں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے ذریعے اپنے عمل سے بعض جاہلانہ رسوم و معتقدات کی اصلاح فرما کر امت کو صحیح راہِ عمل

[1] سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۲۲۳ [2] سیرۃ ابن ہشام ۲/ ۲۹۵

دکھائی؛ چنانچہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے متبنّیٰ کو حقیقی بیٹا قرار دینے اور اس کی مطلقہ سے نکاح نہ ہونے کے تصور کے غلط ہونے کو واضح فرمادیا، ارشادِ باری ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ [1]

"پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے، جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں اور خدا کا یہ حکم تو ہونے ہی والا تھا۔"

۳۔ بعض خاص صحابہ کا اعزاز و اکرام

چنانچہ سیدہ عائشہ اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہما سے نکاح کا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے یارِ غار صدیق اکبر اور فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے دیرینہ مخلصانہ تعلقات کو سرالی و دامادی رشتے کے ذریعے مزید مستحکم کر کے انھیں اس خاص اعزاز و اکرام سے نوازا جائے۔

۴۔ قبیلے پر نوازشات اور مخالفین کی حیثیت عرفی کا لحاظ

آپ کے نکاح سے بعض مرتبہ فوری عمومی فائدہ یہ ہوا کہ قبیلے کی ایک خاتون سے نکاح کی خبر جیسے ہی عام ہوئی مسلمانوں نے اس رشتہ داری کے احترام میں، قبیلے کے جن افراد کو غلام اور باندی بنا رکھا تھا، سب کو آزاد کر دیا؛ چنانچہ حضرت جویریہ بنت حارث سے جو قبیلہ بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں، نکاح کی خبر سے مسلمانوں نے بنو مصطلق کے تمام قیدی جو جنگ میں ہاتھ لگے تھے، آزاد کر دیے اور کہنے لگے:

أصهار رسول الله يسترقون؟

کیا رسول اللہ ﷺ کے سسرالی رشتہ داروں کو غلام بنایا جاسکتا ہے؟

---

[1] الاحزاب: ۳۷

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جویریہ بنت حارث کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کر لینے سے بنو مصطلق کے سو گھرانوں کو آزادی نصیب ہوگئی، میرے علم میں نہیں کہ کوئی اور خاتون، جویریہ سے زیادہ اپنی قوم کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنی ہو۔ [۱]

اسی طرح بعض نکاح میں دشمنوں کی حیثیت عرفی اور آنے والی زوجہ کی نسبی وخاندانی وجاہت کا خیال بھی پیش نظر رہا؛ چنانچہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا باپ حیی بن اخطب یہودیوں کے نامور قبیلے بنونضیر کا سردار اور بے حد معزز شخص تھا۔ باپ نے اپنی بیٹی کا نکاح اسلام بن مشکم القرظی سے کردیا؛ لیکن اس سے طلاق ہوجانے کے سبب کنانہ بن ابی الحقیق سے کردیا جو خیبر کے رئیس ابو رافع کا بھتیجا اور خود بھی خیبر کے قلعہ القموص کا حاکم تھا۔

۷ھ میں یہودیوں کی شرارت کا قلع قمع کرنے کے لیے مسلمانوں نے جب خیبر پر چڑھائی کی تو وہاں سے حاصل ہونے والے اموال غنیمت میں حضرت صفیہؓ بھی شامل تھیں، جن کے باپ، بھائی اور شوہر جنگ میں کام آگئے تھے اور وہ نہایت قابل رحم حالت میں تھیں۔ جب مال غنیمت تقسیم ہونے لگا تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے حضرت صفیہؓ کو اپنے لیے پسند کرلیا؛ لیکن چوں کہ وہ تمام اسیران جنگ میں معزز تھیں؛ اس لیے صحابہ نے عرض کیا: صفیہ بنو قریظہ اور بنونضیر کی رئیسہ ہے، خاندانی وقار اس کے بشرے سے عیاں ہے، وہ ہمارے سردار (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ہی موزوں ہے؛ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت دحیہ کلبیؓ کو دوسری لونڈی عطا فرماکر حضرت صفیہ کو آزاد کردیا اور انھیں اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو اپنے گھر چلی جائیں یا چاہیں تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجائیں۔ انھوں نے نکاح میں آنا پسند کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حسب منشاء ان سے نکاح فرمالیا، صہبا کے مقام پر رسم عروسی ادا کی گئی اور وہیں دعوت ولیمہ بھی ہوئی۔ [۲]

---

[۱] زاد المعاد ۳/۲۵۸

[۲] السیرۃ النبویہ ۲/۳۳۶، البدایہ والنہایہ ۴/۱۹۷-۱۹۸

۵-اشک شوئی و دل جوئی

بعض نکاح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ازواج کے خاص حالات کے پیش نظر ان کی اشک شوئی، کفالت اور دل جوئی کے لیے بھی کیے: جیسا کہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا، ابتدا میں ہی مسلمان ہو کر اپنے شوہر حضرت سکران بن عمرو کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئیں، جب وہاں سے مکہ واپسی ہوئی تو حضرت سکران انتقال کر گئے اور یہ بے سہارا ہو گئیں، گھر والوں کی طرف بھی لوٹ نہیں سکتی تھیں؛ کیوں کہ وہ سب اسلام کے خلاف سخت رویہ رکھتے تھے، ادھر ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی افسردہ اور اپنی بچیوں کی دیکھ بھال کے لیے فکرمند رہتے تھے؛ چنانچہ حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کے مشورے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہ سے نکاح فرما لیا۔

اسی طرح ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نہایت کربناک حالات سے گزری تھیں، حبشہ کے بعد جب اپنے شوہر حضرت ابو سلمہ کے ہمراہ مدینہ منورہ ہجرت کے لیے نکلیں، تو ان کے میکے والوں نے نہیں جانے دیا اور ابو سلمہ کو تنہا مدینہ روانہ ہونا پڑا، کچھ دنوں کے بعد سسرال والے چھوٹے بچے کو بھی ان کے پاس سے چھین لے گئے، اس طرح تینوں جدا ہو گئے، پھر ایک صاحب کی رحم دلی سے بچہ واپس ملا اور وہ مدینہ پہنچیں؛ لیکن یہاں غزوۂ احد کے بعد محبوب اور غم گسار شوہر حضرت ابو سلمہ انتقال کر گئے اور وہ پھر قابل رحم حالت کو پہنچ گئیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کبر سنی کے باوجود نکاح فرما کر ان کو عزت و اطمینان والی زندگی سے نوازا۔

نکاحوں کا محرک خواہش نفس یا شہوت پرستی ہرگز نہیں

اوپر کی تفصیلات سے یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے نکاح کیے ان کے پیچھے انسانی، دینی، تعلیمی، عمومی اور خصوصی مصلحتیں تھیں اور یہ حضرات ان ازواج کے لیے اور پوری امت کے لیے خیر کثیر اور نفع عظیم کا باعث بنے اور تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان نکاحوں کا محرک محض خواہش نفس کی تکمیل

یا شہوت پرستی ہرگز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ درج ذیل حقائق سے بھی اس تاثر کی پوری طرح نفی ہو جاتی ہے:

ا- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عین عنفوان شباب پچیس سال کی عمر میں اپنا پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کرتے ہیں جن کے اس سے قبل دو نکاح ہو چکے ہیں اور عمر بھی چالیس سال تک پہنچ چکی ہے اور پچیس سال تک وہی آپ کی اکلوتی بیوی ہوتی ہیں اور آپ اپنی عمر کے پچاس سال تک کوئی دوسرا نکاح نہیں کرتے، یہاں تک کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کا غم آپ کو جھیلنا پڑتا ہے۔

ب- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں جتنی خواتین آئی ہیں، ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا تمام کی تمام شادی شدہ تھیں، کوئی کنواری نہیں تھیں، بعض کی ایک بار اور بعض کی دو بار شادی ہو چکی تھی، سابق شوہر کی وفات یا اس سے طلاق کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں۔

ج- اکثر بیویوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح اس وقت ہوا ہے جب آپ کی عمر مبارک پچاس کیا، ستاون سال سے بھی متجاوز ہو چکی تھی، جیسا کہ درج ذیل نقشے سے واضح ہے:

نمبر شمار	ام المومنین کے اسماء گرامی	نکاح کا سال	بہ وقت نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک
۱	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا	۱۵ قبل نبوت	۲۵ سال
۲	حضرت سودہ رضی اللہ عنہا	۱۰ نبوی	۵۰ سال
۳	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا	۱۱ نبوی	۵۱ سال
۴	حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا	۳ ھ	۵۶ سال
۵	حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا	۴ ھ	۵۷ سال
۶	حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا	۴ ھ	۵۷ سال

۷	حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا	۵	ھ	۵۸ سال
۸	حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا	۶	ھ	۵۹ سال
۹	حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا	۷	ھ	۶۰ سال
۱۰	حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا	۷	ھ	۶۰ سال
۱۱	حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا	۷	ھ	۶۰ سال

(شیخ ایہاب کمال احمد، ردافتراءات اللئامaluka.net)

تو اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم العیاذ باللہ شہوت پرست اور عورتوں کے شیدا تھے؛ تو آپ نے عین جوانی میں چالیس سالہ خدیجہؓ کے بجائے کسی حسین وجمیل کنواری لڑکی کا انتخاب کیوں نہیں کیا اور پچاس سال کی عمر تک ایک ہی نکاح پر کیسے اکتفا کرلیا اور زیادہ تر نکاح ستاون سال کی عمر کے بعد ہی کیوں کیے؟

دیگر مذاہب کی مقدس شخصیات کے یہاں تعدد ازواج

اب ہم اس مسئلے کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھتے ہیں کہ کیا ایک سے زائد نکاح کوئی نئی چیز تھی جس کی ابتدا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی؟ اور کیا یہ واقعی کسی عظیم مذہبی شخصیت کے لیے نامناسب عمل ہے کہ یہود ونصاریٰ اور ہندوؤں نے اس کی بنا پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو مطعون کرنے کی سعی نامشکور کر رکھی ہے؟ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں ہی مفروضے غلط ہیں؛ نہ تو یہ نامناسب عمل ہے اور نہ ہی اسلام سے اس کی ابتدا ہوئی ہے؛ بلکہ یہود ونصاریٰ کی مسلّم شخصیات، انسانیت کے سب سے افضل اور منتخب طبقے انبیاء کرام علیہم السلام اور ہندوؤں کے بھگوانوں کے یہاں صدیوں پہلے یہ روایات ملتی ہیں۔

چنانچہ تورات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں: سارہ، ہاجرہ اور قتورہ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، راخل اور بلہ۔ اسی طرح

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں اور انھیں لاتعداد بیویوں کی اجازت تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی نو بیویاں جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیگمات اور تین سو حرمیں تھیں۔

دوسری جانب ہندوؤں کے سب سے بڑے دیوتا رام کے والد راجہ دشرتھ کی تین بیویاں ہٹ رانی کوشلیا، رانی سمترا اور رانی کیکئی معروف ہیں۔ کرشن جی کی 100,16 بیویاں بتائی جاتی ہیں، لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب ''کرشن چرتر'' میں ۱۸؍رانیوں کو خود ہی تسلیم کیا ہے۔ [۱]

ان متعدد بیویوں کی وجہ سے ان شخصیات کو ماننے والوں کے نزدیک ان کے تقدس میں کوئی فرق نہیں آیا تو آخر سید الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاح کیسے نامناسب اور غلط قرار دیے جاسکتے ہیں؟ جب کہ یہ سارے نکاح تعلیمی، معاشرتی، دینی اور شرعی مصلحتوں سے ہوئے تھے۔

چار سے زائد ازواج کو نکاح میں رکھنے اور طلاق نہ دینے کی ایک اہم سماجی و شرعی مصلحت

پہلے ہی اس سوال کے جوابات دیے جاچکے ہیں کہ جب ایک عام مسلمان کے لیے صرف چار کی اجازت ہے تو رسول اکرم ﷺ کے نکاح میں بہ یک وقت نو خواتین کیسے جمع ہوئیں؟ یہاں ان جوابات کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے؛ البتہ اس کی ایک اور خاص وجہ بھی ہے، جو خود قرآن کریم سے سمجھ میں آرہی ہے۔ اس کو سمجھ لینے سے ذہن پوری طرح صاف ہوجاتا ہے کوئی خلجان باقی نہیں رہتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سورۃ الاحزاب میں ازواج مطہرات کو تمام مسلمانوں کی مائیں قرار دیا گیا ہے: چنانچہ ارشاد ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ [۲]

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے: رحمۃ للعالمین، جلد دوم، ص۹۹-۱۰۲

[۲] الاحزاب:۶

نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔"

اور اسی وجہ سے ان ازواج میں سے ہر ایک "ام المومنین" کہلاتی ہیں؛ لیکن ان کا یہ مقام محض اعزاز واکرام کے لیے نہیں ہے؛ بلکہ اس کے کچھ عملی پہلو بھی ہیں؛ چنانچہ اسی سورت میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ
بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا [1]

"اور تم کو جائز نہیں کہ رسول اللہ کو کلفت پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔"

جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ ازواج امت کی مائیں ہیں اور امت کے افراد بیٹے ہیں اور جیسے ماں بیٹے میں مناکحت ممنوع ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے کسی فرد کا نکاح ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتا ہے۔ تو چار کی ممانعت کے بعد جیسے دیگر صحابہ نے زائد بیویوں کو الگ کردیا ایسے ہی اگر آپ بھی اپنی کسی بیوی کو زوجیت سے الگ کردیتے تو ان کے لیے بڑی دشواری پیش آجاتی؛ کیوں کہ عام عورتوں کی طرح ان کو کسی بھی مرد سے بیٹے ہونے کی نسبت سے نکاح کی اجازت ہی نہیں تھی۔ اس طرح وہ بے یارومددگار اور بغیر کسی شوہر کے رہ جاتیں؛ اس لیے ان میں سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت سے محروم نہیں کیا گیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چار سے زیادہ بیویوں کو بہ دستور اپنے نکاح میں رکھنا دینی ومعاشرتی مصالح کے ساتھ خود ان معزز خواتین کے احترام اور مفاد میں تھا۔

بعض مغربی مصنفین کا اعتراف حقیقت

ایک معاصر مغربی مصنفہ کیرن آرام اسٹرانگ اپنی کتاب Mohammad a Prophet for our Time میں لکھتی ہیں:

[1] الاحزاب: ۵۳

''قرآن میں تعدد ازدواج کا حکم سماجی قانون کا ایک حصہ ہے، اس کا مقصد مردانہ جنسی خواہشات کو بڑھانا نہیں تھا؛ بلکہ ان ناانصافیوں اور مظالم کی اصلاح کرنا تھا جو بیواؤں، مطلقہ عورتوں اور دیگر خواتین کے ساتھ روا رکھے جاتے تھے۔ایسا بہت ہوتا تھا کہ سرکش لوگ خاندان کے کمزور لوگوں سے سب کچھ چھین لیتے اور ان کے پاس کچھ نہ بچتا۔۔۔تعدد ازدواج کا جواز اسی لیے تھا کہ پریشان حال عورتوں کی عزت کے ساتھ شادی کو یقینی بنایا جاسکے، پرانے نقصان کی تلافی ہو اور غیر ذمہ دارانہ تعلقات کا خاتمہ کیا جائے۔دراصل قرآن عورتوں کو وہ قانونی حیثیت دینا چاہتا تھا، جو اکثر مغربی عورتوں کو انیسویں صدی کے آخر تک نہیں ملی تھی، آزادیٔ نسواں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہایت عزیز منصوبہ تھا۔''

برطانوی سیرت نگار آر۔ وی۔ سی باڈلی اپنی کتاب ''دی لائف آف محمد'' میں رقم طراز ہے:

''پیغمبر اسلام کی ازدواجی زندگی کو مغربی پیمانوں سے ناپنے کی مطلق ضرورت نہیں، نا ہی عیسائی طرزِ حیات سے، یورپ اور امریکہ کی طرزِ زندگی کا اسلام اور مسلمانوں کے طرزِ حیات سے موازنہ کرنا بھی فضول ہے؛ جب تک مغرب کے عوام یہ ثابت نہ کردیں کہ ان کی طرزِ معاشرت دیگر اقوام سے اونچی اخلاقی اقدار پر استوار ہے؛ ان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو کم تر نہ سمجھیں۔''(Fikrokhabar.com)

●●●

امّ المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش سے نکاح

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے بعد اس کے استحکام اور دیگر دعوتی، دینی اور اعلیٰ سماجی مقاصد کے لیے متعدد نکاح کیے۔ ان میں سے ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کئی معنوں میں انتہائی اہمیت کا حامل اور اسلام کی انقلابی تحریکِ اصلاح کا نمایاں باب ہے۔ پہلے آپ نے حضرت زینبؓ کا نکاح غلام کی حیثیت سے آپ کے پاس پہنچنے والے، منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر کے عربوں میں خاندانی تفوق، نسبی تفاخر اور طبقاتی اونچ، نیچ کا جو تصور تھا، اس پر ضرب کاری لگائی، رنگ و نسل اور خاندان و وطن سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے رشتے کی عظمت دلوں میں جاگزیں کر دی، پھر جب طبعی مناسبت نہ ہونے اور ناچاقی کے سبب دونوں میں نباہ نہیں ہو سکا تو طلاق اور عدت کے بعد حضرت زینبؓ خاص خدائی فرمان کے تحت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آ گئیں اور اس طرح صدیوں سے چلی آ رہی اس رسم قبیح پر قدغن لگ گئی کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کے درجے میں ہے اور سگی اولاد کی طرح اس کی بیوی سے بھی مناکحت جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ عربوں میں اسے بہت برا خیال کیا جاتا تھا اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کی طرف سے طعنہ زنی ہوئی؛ لیکن آپ نے نہایت استقلال اور عزیمت کا ثبوت دیتے ہوئے زبان کے ساتھ عمل سے بھی بتلا دیا کہ بچے کی پرورش اور اس کے ساتھ ہمدردی ایک انسانی فریضہ ضرور ہے؛ تاہم اس سے وہ قرابت اور جزئیت ثابت نہیں ہوتی جو اپنے جگر کے ٹکڑے سے ہوتی ہے؛ اس لیے محض کسی کو بیٹا قرار دینے سے وہ اس کا حقیقی بیٹا اور وارث نہیں بن جائے گا۔

مستشرقین کی ہرزہ سرائی

لیکن مستشرقین ومعاندین نے صالح مقاصد کے لیے انجام پانے والے اس پاکیزہ نکاح کو غلط رخ دے کر اور افسانہ طرازی کر کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو داغ دار و بے وقعت کرنے کی جو مذموم کوشش کی ہے، وہ ان کے خبث باطن، اسلام دشمنی اور حقائق سے چشم پوشی کی واضح دلیل ہے۔ مستشرقین نے اس نکاح کے حوالے سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فطری اعتبار سے عورتوں سے بڑی انسیت وچاہت اور ان کی طرف غیر معمولی میلان تھا اور حضرت زینبؓ کے حسن وجمال سے متاثر ہو کر ہی منہ بولے بیٹے کی بیوی ہونے کے باوجود ان سے نکاح کیا تھا۔ (العیاذ باللہ)

چناں چہ مشہور فرانسیسی مستشرق گستاؤلی بان (۱۸۴۱ء-۱۹۳۱ء) اپنی مشہور زمانہ کتاب ''حضارۃ العرب'' میں اس طرح ہرزہ سرائی کرتا ہے:

''وضعف محمد الوحيد هو حبه الطارئي للنساء... وأطلق العنان لذلك الحب حتى إنه رأى اتفاقا زوجة ابنه بالتبني وهي عارية فوقع في قلبه منها شيء، فسرّحها بعلها ليتزوجها محمد، فاغتم المسلمون، فأوحي إلى محمد بواسطة جبريل الذي كان يتصل به يوميًا آيات تسوغ ذلك، فانقلب الانتقاد إلى السكوت.'' [1]

''ان کی واحد کمزوری عورتوں سے ان کی فوری محبت ہے اور وہ اپنے اس جذبۂ محبت میں اس قدر بے لگام تھے کہ ایک بار اتفاقاً ان کی نظر اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی پر پڑ گئی جب کہ وہ برہنہ تھیں، بس کیا تھا دل میں ان کی محبت جاگزیں ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خاتون کے شوہر کو محمد سے نکاح کے لیے اسے طلاق دینی پڑی، جس سے مسلمانوں کو بڑا رنج ہوا؛ چنانچہ جبریل کے واسطے سے جو روزانہ ان کے پاس آیا کرتے تھے، چند آیات نازل ہوئیں جو اس کا جواز پیش کر رہی تھیں؛ چنانچہ تنقید

[1] حضارۃ العرب، ط: الہیئۃ المصریۃ، ص: ۱۴۲

خاموشی میں تبدیل ہوگئی۔"

اس اقتباس میں رسول مطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے کے ساتھ وحی کی مصدریت کے سلسلے میں بھی تشکیک کی کوشش کی ہے، جس پر "دفاع سیرت طیبہ" سلسلے کے مضمون ۲ میں مدلل گفتگو کی جا چکی ہے۔

گستاولی بان کے علاوہ ولیم میور، واشنگٹن ارونگ، لامینز اور اسپرنگر جیسے مستشرقین اور مشنری مصنفین کی تحریروں میں بھی اس نکاح کے حوالے سے خوب خیال آرائی اور افسانہ سازی کی گئی ہے۔[1]

گفتگو کے چار نکات اور مستشرقین کا ماخذ

اس نکاح کا تذکرہ خود اللہ رب العزت نے سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۷ میں کیا ہے؛ لیکن اس آیت کی تفسیر میں ہمارے بعض مفسرین کی طرف سے کچھ ایسی ضعیف اور بے اصل روایات در آئی ہیں جن سے مستشرقین و معاندین کو مرچ مسالہ لگا کر اپنی خباثتوں کے اظہار اور ذات نبوت پر طعن کے لیے غذا فراہم ہوگئی ہے اور وہ انھیں روایات کے سہارے اپنی بحث کو معروضی بتا کر قارئین کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ اس لیے صحیح صورت حال کی وضاحت اور حقائق تک رسائی کے لیے الگ الگ جہت سے چار ابواب کے تحت گفتگو کی جائے گی۔

۱- روایات کا مختصر جائزہ جن سے مستشرقین استدلال کرتے ہیں۔
۲- روایات صحیحہ سے مخالفین کے دعویٰ کا بطلان۔
۳- سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۷ کی صحیح تفسیر۔
۴- دلائل عقلیہ سے الزامات کی تردید۔

لیکن ان مباحث سے پہلے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا، ان کے پہلے شوہر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ان سے نکاح کے احوال اختصار کے ساتھ درج کیے جا رہے ہیں؛ تاکہ اصل صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملے۔

[1] دیکھیے: حیاۃ محمد، محمد حسین ہیکل، دار المعارف مصر، ص ۳۲۶-۲۲۷

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

اصل نام برہ تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل فرما کر زینب کر دیا تھا۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے: زینب بنت جحش بن رئاب اسدی، آپ کی والدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب ہیں، ہجرت سے ۳۳ سال قبل ولادت ہوئی، نبوت کے ابتدائی دور میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ [۱] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کے لیے نکاح کا پیغام دیا تو چوں کہ حضرت زید پر عالی نسب ہونے کے باوجود غلامی کا دھبہ لگ چکا تھا اور وہ غیر قریشی تھے؛ اس لیے ابتداءً حضرت زینب کے گھر والوں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کیا خود حضرت زینبؓ بھی راضی نہیں تھیں اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش کو بھی یہ رشتہ منظور نہیں تھا۔ [۲]

لیکن اسی دوران آیت کریمہ نازل ہوگئی:

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ [۳]

”اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑ چکا۔“

اس آیت کو سنتے ہی حضرت زینبؓ نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں ٹھکراؤں گی اور مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ حضرت زینب کے بھائی اور دیگر اقارب نے بھی ذاتی اور سماجی برتری کا خیال چھوڑ کر حکم الٰہی کے آگے سر جھکا دیا اور نکاح ہوگیا؛ لیکن مزاج میں عدم توافق کی وجہ سے نباہ نہیں ہوسکا اور طلاق کی نوبت آگئی اور ایام عدت گزرنے کے بعد ذی قعدہ ۵ھ میں بہ امر الٰہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آگئیں، جس کا تذکرہ احزاب کی

[۱] اسد الغابہ ۵/ ۴۶۳ [۲] تفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۸۹

[۳] الاحزاب: ۳۶

آیت نمبر: ۳۷ میں ہے۔اسی بنیاد پر حضرت زینبؓ دیگر ازواج مطہرات پر فخر کرتی تھیں:
"زَوّجكنّ أهاليكُنّ وزوّجني الله من فوق سبع سموات". [۱]
"یعنی تمہارا نکاح تمہارے اولیاء نے کرایا اور میرا نکاح خود اللہ رب العزت نے سات آسمانوں کے اوپر سے کرایا"

آپ کے نکاح سے جاہلیت کی ایک بری رسم تبنیت یعنی لے پالک اور منہ بولا بیٹا بھی اصل بیٹے کی حیثیت رکھتا ہے، کا خاتمہ ہوگیا۔ پردے کا حکم بھی اسی موقع پر نازل ہوا، حضرت زینبؓ ازواج مطہرات میں ممتاز مقام رکھتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"ازواج میں سے وہی عزت و مرتبت میں میرا مقابلہ کرتی تھیں۔"

نیز آپ کے اخلاق و اوصاف ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"میں نے کوئی عورت زینب سے زیادہ دین دار، زیادہ پرہیز گار، زیادہ راست گفتار، زیادہ صلہ رحمی کرنے والی، زیادہ سخی اور خدا کی خوشنودی میں زیادہ سرگرم نہیں دیکھی۔ فقط مزاج میں ذرا تیزی تھی جس پر ان کو بہت جلد ندامت بھی ہوتی تھی۔" [۲]

آپ کی وفات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۲۰ھ میں ہوئی۔ آپ کی کل عمر ۵۳ کے قریب ہوئی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ کی رفاقت چھ سال رہی۔ آپ کے وصال پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اعلان کرایا: اے اہل مدینہ! اپنی ماں کے جنازے میں شرکت کرو؛ چنانچہ ایک بڑی تعداد نے جنازے میں شرکت کی اور جنت البقیع میں آپ مدفون ہوئیں۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

حضرت زید بن حارثہ کا آبائی نسب قضاعہ تک منتہی ہوتا ہے اور ماں کا نسب بھی معن

[۱] صحیح البخاری، حدیث نمبر ۶۹۸۴، کتاب التوحید، ترمذی، حدیث نمبر: ۳۲۱۳
[۲] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث نمبر ۲۴۴۲، سنن النسائی، حدیث نمبر: ۳۹۴۶

بن طے سے ملتا ہے۔ ماں کا نام سعدیٰ تھا، ۸ برس کی عمر میں ننھیال جاتے ہوئے قبیلہ قین کے چند لٹیروں نے آپ کو والدہ سے چھین لیا اور مکہ کے بازار عکاظ میں غلام کی حیثیت سے برائے فروخت لے آئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیمؓ بن حزام نے اپنی پھوپھی کے لیے چار سو درہم میں خرید لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے بعد حضرت خدیجہؓ نے زید بن حارثہ کو تحفے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید پر بڑی شفقت فرمائی اور ان کی بہترین تربیت کی۔ آپ کے اخلاق وعنایات کا حضرت زید پر اس قدر گہرا اثر مرتب ہوا کہ زید کے والد اور چچا عرصے کے بعد تلاش کرتے کرتے جب مکہ مکرمہ پہنچے اور آپؐ سے زید کو واپس کر دینے کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو والدین کے پاس واپس جاسکتے ہیں؛ لیکن زید کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفارقت گوارا نہ ہوئی اور آپ نے والدین کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں غلامی سے آزاد کر کے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور وہ زید بن محمد کہلانے لگے، یہاں تک کہ آیت کریمہ نازل ہوئی: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ [1] ”تم ان کو ان کے باپوں کی طرف منسوب کیا کرو، یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کا نکاح حضرت زینب بنت جحش سے کرایا اور مہر بھی اپنی طرف سے ادا فرمایا۔ حضرت زینبؓ کی علاحدگی کے بعد سیدہ ام کلثوم بنت عقبہ سے آپ کا نکاح کر دیا اور پہلا نکاح حضرت ام ایمنؓ سے ہوا تھا جن سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے۔ حضرت زیدؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھے اور نمایاں خصوصیات وکمالات کے حامل تھے ۸ھ میں غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے آپ کی شہادت ہوئی۔

ا- روایات کا مختصر جائزہ

مؤرخین اور بعض مفسرین نے انھیں کتابوں میں بعض ایسی روایات ذکر کر دی ہیں جو

[1] الاحزاب: ۵

نہ محدثین کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور نہ حقائق سے مطابقت رکھتی ہیں۔ شیخ عبداللہ الذہبی نے اس سلسلے کی چھ روایات کا ذکر کرکے ان کا جائزہ لیا ہے؛ جب کہ بعض محققین نے کل آٹھ روایات اور ان کے طرق ذکر کرکے ان کے بے اصل ہونے کو ثابت کیا ہے: [۱]

چناں چہ محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے: زید بن حارثہ بیمار ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اس وقت ان کی بیوی زینب بنت جحش ان کے سرہانے بیٹھی تھیں، زینب کسی کام کے لیے اٹھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ان پر پڑگئی، آپ نے اپنا سر جھکالیا اور فرمایا: **سبحان الله مقلب القلوب والأبصار**، اللہ پاک ہے جو دلوں اور نگاہوں کو پھیرنے والا ہے۔ حضرت زیدؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں آپ کی خاطر ان کو طلاق دے دوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، اسی پر سورۂ احزاب کی آیت نازل ہوئی۔ [۲]

ابن جریر طبری نے بھی متعدد روایات ذکر کی ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر حضرت زینبؓ پر پڑی اور ان کی محبت آپ کے دل میں گھر کرگئی، تو آپ نے کہا: **سبحان الله العظيم، سبحان الله مصرف القلوب**. [۳]

ذیل میں باب کی روایات کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جارہا ہے۔ ابن اسحاق والی روایت پر گفتگو اخیر میں کی گئی ہے:

ابن جریر نے تفسیر میں جو روایت ذکر کی ہے: وہ عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے مروی ہے۔ اس میں دو علتیں موجود ہیں: پہلی علت اور خرابی یہ ہے کہ عبدالرحمن بن زید نہ تابعی ہیں اور نہ صحابی، گویا سند سے دو یا اس سے زائد راوی غائب ہیں۔ اس طرح یہ روایت معضل قرار پاتی ہے جو قابل قبول نہیں ہوتی ہے۔ دوسری علت یہ ہے کہ عبدالرحمن بن زید

[۱] دیکھیے: الرد بالتفصيل على شبهة الزواج، شبكة ابن مريم الاسلامية

[۲] السير والمغازي، ص: ۲۶۲

[۳] تاریخ الرسول ۳/ ۹۵، تفسیر الطبری ۱۹/ ۱۱۵، دار الهجرة

بالاتفاق ضعیف ہیں، اگر چہ زہد وعبادت میں ان کا خاص مقام ہے۔ [۱] نسائی کہتے ہیں: عبد الرحمن بن زيد بن اسلم ضعيف مدني. [۲]

ابن جریر نے تفسیر میں دوسری روایت حضرت قتادہ سے ذکر کی ہے جو مشہور حافظ ومفسر ہیں؛ البتہ روایت حدیث میں ان کی تدلیس معروف ہے اور اس روایت کو بھی انھوں نے مرسلا سماع کی صراحت کیے بغیر ذکر کردیا ہے جو کہ محل نظر ہے۔ (حافظ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: أحد الأثبات المشهورين كان يضرب به المثل في الحفظ إلا أنه كان ربما دلس، احتج به الجماعة [۳] وذكره الحافظ في الطبقة الثالثة من طبقات المدلسين، وهي التي لا يقبل حديثها إلا إذا صرّحوا بالسماع. [۴]

تیسری ایک طویل روایت ہے جس کی تخریج ابن سعد نے طبقات میں کر رکھی ہے جس کی سند میں وہ کہتے ہیں: أخبرنا محمد بن عمر، قال: حدّثني عبد الله بن عامر الأسلمي، عن محمد بن يحيى بن حبان" اس روایت کی سند میں تین علتیں ہیں: پہلی علت یہ ہے کہ روایت مرسل ہے؛ اس لیے کہ محمد بن یحیٰ تابعی ہیں، جو تابعین اور صحابہ سے روایت کرتے ہیں، تو یقینا یہ واقعہ ان کے سامنے پیش آمدہ نہیں ہے اور نہ انھوں نے واسطے کی وضاحت کی ہے۔ دوسری علت یہ ہے کہ عبداللہ بن عامر اسلمی، بالاتفاق ضعیف ہیں۔ بخاریؒ نے انھیں ذاہب الحدیث اور ابو حاتم نے متروک کہا ہے۔ [۵]

تیسری علت یہ ہے کہ محمد بن عمر واقدی مشہور مؤرخ وکثیر الروایہ ہیں؛ لیکن حدیث کے باب میں محدثین نے ان پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ [۶]

چوتھی روایت مسند احمد [۷] میں مؤمل بن اسماعیل سے ہے جس کو وہ حماد بن زید سے روایت کرتے ہیں: اس میں دو علتیں ہیں: پہلی تو یہ ہے کہ مؤمل بن اسماعیل کے بارے

---

[۱] تہذیب التہذیب ۶/ ۱۷۷
[۲] الضعفاء
[۳] ہدي الساري ص ۴۳۶
[۴] طبقات المدلسين ۱/ ۴۳ المکتبۃ المنار، عمان، شاملہ
[۵] میزان الاعتدال ۲/ ۴۴۸
[۶] میزان ۳/ ۶۶۴
[۷] ۳/ ۱۴۹

میں محدثین نے کلام کیا ہے اور اکثر نے انھیں منکر روایات کرنے والا کثیر الخطا قرار دیا ہے۔[۱] دوسری خرابی یہ ہے کہ حماد کے دوسرے شاگردوں نے روایت کے اس حصے کو ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ انھوں نے بس اخیر کا حصہ ذکر کیا ہے جس میں حضرت زیدؓ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری اور نزول آیت کا تذکرہ ہے۔[۲]

پانچویں روایت امام قرطبیؒ نے قال مقاتل کہہ کر اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے[۳] ظاہر ہے مقاتل تک اس سند کی روایت کا کوئی اتا پتا نہیں اور اگر سند متصل بھی ہو جائے تب بھی خود مقاتل پر ائمہ حدیث نے کلام کر رکھا ہے۔

جہاں تک تعلق ہے چھٹی روایت کا، جس کو زیر نظر مضمون میں پہلے نمبر پر ذکر کیا گیا ہے۔ تو یہ روایت سیرۃ ابن ہشام میں تو مل نہیں سکی؛ البتہ ابن اسحاق کی السیر والمغازی میں ضرور موجود ہے۔ اس کی سند ابن اسحاق نے اس طرح ذکر کی ہے: یونس عن أبي سلمة الهمداني مولى الشعبي عن الشعبي قال: تو اس روایت کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ابو سلمہ مولی الشعبی سلیم الکوفی ہیں، جن کے متعلق یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: سلیم مولی الشعبي ضعيف، جب کہ امام نسائی نے ذکر کیا ہے: مولى الشعبي ليس بثقة. [۵]

دوسری بات یہ ہے کہ یہ مراسیل شعبی کی قبیل سے ہے اور مراسیل شعبی کے سلسلے میں محدثین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ ضعیف ہیں۔ ان کی زیادہ تر مرسل روایتیں حارث اور جابر سے ہیں۔ جن کی خود انھوں نے تکذیب کر رکھی ہے۔[۶]

خلاصہ یہ کہ متن کے تعارض وتخالف سے قطع نظر سنداً بھی کوئی روایت محدثین کے

---

[۱] تہذیب ۱۰/۳۸۱

[۲] دیکھیے: بخاری: حدیث نمبر: ۴۲۰۷ اور ترمذی حدیث نمبر: ۳۲۱۲

[۳] ۱۴/۱۹۰

[۴] تہذیب ۱۰/۲۷۹

[۵] الکامل فی ضعفاء الرجال ۴/۳۲۳

[۶] دیکھیے: شرح کتاب العلل لابن رجب ۱/۱۹۵ شاملہ

معیار پر پوری نہیں اترتی؛ لیکن مستشرقین کو اس علمی بحث اور معیار نقد وقبول سے کیا غرض! انھیں تو بس اپنے مطلب کی کوئی بات مل جانی چاہیے خواہ وہ ثابت ہو یا نہ ہو۔

روایات کے سلسلے میں ابن کثیرؒ کی رائے

اس لیے بعد کے مفسرین ومحدثین نے مجموعی اعتبار سے ان ساری روایات پر نا قابل اعتبار ہونے کا حکم لگایا ہے: حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

ذکر ابن جریر وابن أبي حاتم ھاھنا آثارا عن بعض السلف رضی اللہ عنھم أحببنا أن نضرب عنھا صفحا لعدم صحتھا فلا نوردھا۔ [1]

"اس مقام پر ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بعض آثار سلفؒ کو ذکر کیا ہے؛ لیکن ان کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے ان کو پوری طرح نظر انداز کرنا ہی ہم نے بہتر خیال کیا ہے؛ اس لیے ہم انھیں ذکر نہیں کریں گے۔"

حافظ ابن حجرؒ کا تبصرہ

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

ووردت آثار أخرى أخرجھا ابن أبي حاتم والطبري ونقلھا كثير من المفسرين لا ينبغي التشاغل بھا، والذي أوردته منھا ھو المعتمد، والحاصل أن الذي كان يخفيه النبي صلى الله عليه وسلم ھو إخبار الله إياه أنھا ستصير زوجته" [2]

"کچھ دوسرے آثار بھی وارد ہوئے ہیں جن کی تخریج ابن ابی حاتم اور طبری نے کی ہے اور بہت سے مفسرین نے انھیں نقل کیا ہے۔ ان آثار میں لگنا مناسب نہیں ہے۔ میں نے یہاں جو ذکر کیا ہے وہی قابل اعتماد ہے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو مخفی رکھا تھا، وہ تھا اللہ پاک کا آپ کو یہ بتا دینا کہ زینب آپ کی زوجہ بنیں گی۔"

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۶ / ۴۲۴ دار طیبہ

[2] فتح الباری ۱۲ / ۵۰۳ دار طیبہ

قاضی ابوبکر ابن العربی نے بھی ان ساری روایات کو ساقط الاسناد قرار دیا ہے۔ [۱]

۲۔روایات صحیحہ سے مخالفین کے دعوے کا بطلان

الف۔یہ بات غلط ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ حضرت زینبؓ پر پڑی تھی جب کہ ان کے جسم کا کچھ حصہ کھلا تھا، اسی طرح یہ دعویٰ بھی محض افتراء ہے کہ حضرت زیدؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت محسوس کر کے حضرت زینبؓ سے دست برداری اور طلاق دینے کی پیش کش کی تھی؛ بلکہ روایات صحیحہ سے صرف اس قدر ثابت ہے کہ حضرت زید بن حارثہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت زینبؓ کا شکوہ کیا اور طلاق کا ارادہ ظاہر کیا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارادے سے باز رہنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کی؛ حالاں کہ آپ کو بہ ذریعہ وحی معلوم ہو چکا تھا کہ زینبؓ کی زید سے علاحدگی ہوگی اور وہ آپ کے حبالۂ عقد میں آئیں گی؛ لیکن آپ نے اس کا اظہار نہیں کیا کہ لوگوں کو اگر معلوم ہوگا تو جاہلیت کے رسم کے پیش نظر طعن کریں گے کہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر رہے ہیں؛ چنانچہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح البخاری کی یہ روایت دیکھیے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> زید بن حارثہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نکاح میں رہنے دو، حضرت انس فرماتے ہیں: اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کو چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے۔" [۲]

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حماد بن زید سے اس کے علاوہ بھی دو طریق سے اس کی تخریج کر رکھی ہے۔

ب: صحیح روایات کی روشنی میں مستشرقین کا یہ دعویٰ بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول

---

[۱] احکام القرآن ۳/ ۵۷۷ دار ابن کثیر

[۲] صحیح البخاری کتاب التوحید، حدیث نمبر: ۶۹۸۴

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ اپنی طرف سے منہ بولے بیٹے کا حکم کالعدم قرار دینے کی آیت اس لیے گڑھ لی تھی؛ تا کہ اس نکاح کی راہ ہموار ہو سکے؛ اس لیے کہ آیت نکاح سے ایک مدت قبل ہی تبنّی کی تحریم کا حکم جس آیت میں ہے یعنی سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵ نازل ہو چکی تھی۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ [۱]

چناں چہ صحیح بخاری (۴۸۰۰) میں حضرت ابوحذیفہ کا تذکرہ ہے جنھوں نے سالم کو منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ اس حکم کے نزول کے بعد ابوحذیفہ کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سالم کے تعلق سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے بعد انھوں نے سالم کو اپنا دودھ پلا دیا اور اس طرح سالم ان کے رضاعی بیٹے قرار پائے اور پردے وغیرہ کی دشواریوں سے نجات مل گئی۔ [۲]

اور یہ بات واضح ہے کہ سہلہ نے دودھ اسی وقت پلایا ہوگا جب کوئی شیر خوار بچہ ان کی گود میں رہا ہوگا اور تاریخی طور پر ثابت ہے کہ سہلہ سے ابوحذیفہ کے صرف ایک بیٹے محمد کا تولد ہوا ہے، جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت گیارہ سال تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ محمد کی پیدائش یا تو سن ایک ہجری میں ہوئی یا ہجرت سے کچھ قبل ہوئی۔ جس سے واضح ہے کہ آیت تحریم کا نزول حضرت زینبؓ کے نکاح سے قبل مدینہ منورہ کی ابتدائی زندگی میں ہی ہو چکا تھا۔ [۳]

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل حضرت زید بن حارثہ کو منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ اس لیے انھیں زید بن محمد کہا جاتا تھا؛ لیکن اللہ پاک نے جب اپنے ارشاد

---

[۱] الاحزاب: ۵

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے: ابوداؤد شریف، حدیث نمبر ۲۰۶۱

[۳] دیکھیے: الرد بالتفصیل، ابن مریم ڈاٹ کام

''وما جعل أدعيائكم أبنائكم الخ کے ذریعے اس نسبت کو ختم کر دیا تو اس کے بعد مزید تاکید اور وضاحت کے لیے زید بن حارثہ کے طلاق دینے کے بعد حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح کر دیا۔'' [۱]

ج: مستشرقین کا یہ الزام بھی بالکل غلط ہے کہ حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہتے ہوئے ہی حضرت زینبؓ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح کر دیا گیا اور اس پر آیت نازل ہوگئی۔ اس لیے کہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت زید کے طلاق دینے؛ بلکہ حضرت زینبؓ کی عدت مکمل ہونے کے بعد ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انھیں نکاح کا پیغام دیا گیا؛ چنانچہ صحیح مسلم، کتاب النکاح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے اس کا حاصل دیکھیے:

طلاق کے بعد ایام عدت پورے ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ سے فرمایا: زینب کو میری طرف سے پیغام نکاح دے دو، حضرت زید فرماتے ہیں: جب میں زینب کے پاس پہنچا تو وہ میری نگاہ میں نہایت قابل عزت واحترام تھیں کہ میں ان کی طرف نظر نہ اٹھا سکا۔ یہاں تک کہ میں ان کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو نکاح کا پیغام دوں' حضرت زینبؓ نے فرمایا: میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتی یہاں تک کہ اس بارے میں اپنے رب سے مشورہ نہ کرلوں، پھر اٹھ کر نماز استخارہ پڑھنا شروع کر دی، ادھر دوسری طرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترنا شروع ہوگئی، جس میں اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے آپ کا نکاح زینب سے کر دیا ہے۔'' چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور بغیر اجازت کے حضرت زینبؓ کے پاس داخل ہوئے۔'' [۲]

[۱] تفسیر ابن کثیر ۶/۴۲۶
[۲] صحیح مسلم: ۱۴۲۸

۳-سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۷ کی صحیح تفسیر

سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۷ میں جہاں اس واقعے کا تذکرہ ہے، اس کی خود قرآن مقدس اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں جو صحیح تفسیر ہے، اس کو نظر انداز کرکے ضعیف اور بے اصل روایات کا سہارا لینے کی وجہ سے بھی مسائل پیدا ہوئے اور مخالفین کے لیے دلچسپی اور ذات نبوت پر طعن کا سامان فراہم ہوگیا؛ اس لیے ان آیات کا ترجمہ اس کی صحیح تفسیر مختصر پس منظر کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾ [۱]

''اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور خدا سے ڈر اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے۔ پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی۔''

صحیح اور مختصر تفسیر

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی

[۱] الاحزاب: ۳۷

شادی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کی گئی؛ لیکن ان کے مزاج باہم نہ ملے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی زبان کی تیزی اور خاندانی شرافت و کرامت کے سبب ان میں موجود احساس برتری کا گلہ کرتے رہتے؛ جب کہ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو طلاق دیں گے جس کے بعد ان کی شادی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگی، ایک دن حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور انھیں طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو اس بات سے روک دیا؛ کیوں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی طلاق کے بعد اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرتے تو عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نشانہ تنقید بناتے؛ کیوں کہ زمانہ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرنا ممنوع تھا۔

اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے محبوبانہ عتاب قرآن کی ان آیات میں نازل ہوا:

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ؕ

”یعنی آپ اس وقت کو یاد کریں جب کہ آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا“ مراد اس شخص سے حضرت زیدؓ ہیں۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے پہلا انعام تو یہ فرمایا کہ ان کو مشرف بہ اسلام کر دیا، دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف عطا فرمایا۔ اور آپ نے ان پر ایک انعام تو یہ کیا کہ ان کو غلامی سے آزاد کر دیا، دوسرا یہ کہ ان کی تربیت فرما کر ایسا بنا دیا کہ بڑے بڑے صحابہ بھی ان کی تعظیم کرتے تھے۔ آگے وہ قول نقل کیا جو آپ نے زیدؓ سے بیوی کو طلاق نہ دینے اور خدا سے ڈرنے کے متعلق فرمایا: آپ کا یہ فرمانا اپنی جگہ صحیح و درست تھا؛ مگر من جانب اللہ ہونے والے واقعے کا علم ہو جانے اور دل میں حضرت زینبؓ سے نکاح کا ارادہ پیدا ہو جانے کے بعد زیدؓ کو طلاق نہ دینے کی نصیحت ایک طرح کی رسمی اظہار خیر خواہی کے درجے میں تھی، جو

شانِ رسالت کے مناسب نہ تھی، خصوصاً اس لیے کہ اس کے ساتھ لوگوں کے طعنوں کا اندیشہ بھی شامل تھا۔ [1]

پوشیدہ امر کیا تھا؟ دراصل آیت بالا میں جو فرمایا گیا ہے ''وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِیۡهِ'' آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا'' کے سلسلے میں بعض لوگوں نے بعض کمزور روایات کی بنا پر جو گزر چکیں، یہ کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو طلاق نہ دینے کا مشورہ دیتے وقت حضرت زینبؓ کی محبت اور زید کے طلاق دینے کی تمنا کو دل میں چھپا رکھا تھا اور اس غلط تفسیر کی وجہ سے مستشرقین کو ایک افسانہ ترتیب دینے کا موقع مل گیا حالاں کہ صحیح بات وہی ہے جو ذکر کی گئی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید سے اس بات کا اظہار نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرما رکھا ہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو گے اور اس کے بعد وہ بہ حکم الٰہی میری زوجیت میں آئیں گی، لوگوں کی تنقید کے خوف سے آپ دل میں ہی یہ بات چھپائے رہے۔

پہلی دلیل: اس کی بہت واضح دلیل جو خود قرآنِ کریم سے ثابت ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ آپ نے جس کو چھپا رکھا ہے اللہ اس کو ظاہر کر دے گا اور ظاہر ہے اللہ پاک نے تزویج یعنی حضرت زینبؓ سے نکاح کو ہی ظاہر کیا ہے؛ چنانچہ فرمایا:

''فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَهَا''۔

اللہ پاک نے اس کو ہرگز ظاہر نہیں کیا ہے کہ آپ نعوذ باللہ حضرت زینبؓ پر فریفتہ ہو گئے تھے، جیسا کہ مخالفین کا خیال ہے۔ علامہ محمود آلوسیؒ فرماتے ہیں:

> **وحاصل العتاب لِمَ قلت أمسک علیک زوجک، وقد أعلمتک أنه ستکون من أزواجک، وهو مطابق للتلاوة لأن الله تعالی أعلم أنه مبدي ما أخفاه علیه الصلاة والسلام، ولم یظهر غیر تزویجها منه فقال سبحانه: زوجناکها" فلو کان المضمر محبتها وإرادة طلاقها**

---

[1] دیکھیے: معارف القرآن مع آسان ترجمۂ قرآن ۷/۱۷۱

ونحو ذلک لأظهره جل وعلا، وللقصاص في هذه القصة كلام لا ينبغي أن يجعل في حيز القبول. [۱]

"عتاب کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے یہ کیوں کہا کہ بیوی کو اپنی زوجیت میں رہنے دو حالاں کہ میں نے آپ کو بہ ذریعہ وحی بتادیا تھا کہ وہ آپ کی بیوی بنیں گی اور یہی آیت قرآنی کے مطابق ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بتلادیا ہے کہ وہ اس چیز کو ظاہر کردے گا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپائے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہمراہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے علاوہ کسی اور چیز کو ظاہر نہیں کیا، چنانچہ فرمایا: زوجنا کہا، تو اگر زینب کی محبت ان کو طلاق دلانے کا ارادہ یا کوئی اور چیز چھپائی گئی ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ضرور ظاہر فرمادیتے۔ اس واقعے میں افسانہ سازوں نے نامناسب حکایت سازی کی ہے جسے قبول نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

دوسری دلیل: اللہ پاک نے اس آیت کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللهُ لَهُ [۲]

"ان پیغمبر کے لیے خدا تعالیٰ نے جو بات مقرر کردی تھی اس میں نبی پر کوئی حرج نہیں۔"

اس سے واضح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح میں کوئی حرج نہیں تھا، اگر وہاں زینب رضی اللہ عنہا کی محبت اور زید کی طرف سے طلاق کی خواہش کی بنیاد پر نکاح ہوا ہوتا تو اس میں حرج عظیم ہوتا؛ کیوں کہ دوسرے کی بیوی پر نظر ڈالنا اور شوہر سے الگ ہوکر اپنی زوجیت میں لینے کی تمنا ناروا عمل ہے۔ خود اللہ رب العزت نے اس آیت میں عام ممانعت فرمادی ہے:

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ [۳]

---

[۱] روح المعانی ۱۱/۲۷۱ [۲] الاحزاب: ۳۸

[۳] الحجر: ۸۸

''آپ آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھیے جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو برتنے کے لیے دے رکھی ہے اور ان پر غم نہ کیجیے اور مسلمانوں پر شفقت رکھیے!''

تیسری دلیل: اللہ رب العزت نے حضرت زینبؓ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا [1]

''اور جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا؛ تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں۔''

اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ اس نکاح کی حکمت منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کے حرام ہونے کے تصور کو ختم کرنا ہے اور اسی لیے اللہ پاک نے حضرت زینبؓ سے آپ کا نکاح کرایا ہے۔ اس آیت سے بھی واضح ہو گیا کہ اس نکاح کا سبب زینب کی محبت اور زید سے طلاق کی خواہش ہرگز نہیں ہے اور فلما قضی الخ سے بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ زید نے اپنی ضرورت پوری کر لی اور زینبؓ کی کوئی حاجت نہیں رہی تو انھوں نے اپنے اختیار سے طلاق دے دی۔ [2]

امام بغویؒ اور قرطبیؒ کی رائے

امام بغویؒ نے اس تفسیر کو تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے:

وهذا هو الأولى و الأليق بحال الأنبياء و هو مطابق للتلاوة.

''انبیاء علیہم السلام کے حال کے زیادہ لائق اور مناسب ہے اور یہی آیت قرآنی کے مطابق ہے۔'' [3]

---

[1] الاحزاب: ۳۷

[2] آخر الذکر دونوں دلیل کے لیے دیکھیے: الشفاء ۲/ ۱۱۸، اضواء البیان ۶/ ۵۸۳

[3] معالم التنزیل ۳/ ۵۳۲

امام قرطبیؒ نے اس قول کو اختیار کرتے ہوئے اسی کو محقق مفسرین اور علماء راسخین کا
قول قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم على جهة الأدب والوصية اتق الله في قولك وأمسك عليك زوجك وهو يعلم أنه سيفارقها ويتزوجها، وهذا هو الذي أخفى في نفسه، ولم يرد أن يأمره بالطلاق لما علم أنه سيتزوجها، وخشي رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يلحقه قول من الناس في أن يتزوج زينب بعد زيد، وهو مولاه، وقد أمره بطلاقها، فعاتبه الله تعالى على هذا القدر من أن خشي الناس في شيء قد أباحه الله له، بأن قال: أمسك مع علمه بأنه يطلق، وأعلمه أن الله أحق بالخشية، أي في كل حال، قال علماؤنا رحمة الله عليهم: وهذا القول أحسن ما قيل في تأويل هذه الآية، وهو الذي عليه أهل التحقيق من المفسرين والعلماء الراسخين كالزهري والقاضي بكر بن العلاء القشيري، والقاضي أبي بكر ابن العربي وغيرهم. [1]

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے (جب انھوں نے زینبؓ کی شکایت کرکے طلاق کا ارادہ کیا) تربیت اور نصیحت کے طور پر فرمایا اپنی اس بات میں اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق مت دو؛ حالاں کہ آپؐ کو معلوم تھا کہ زید انھیں چھوڑ دیں گے اور وہ آپ کی زوجیت میں آئیں گی، یہی وہ امر ہے جس کو آپ نے اپنے دل میں مخفی رکھا اور آپ نے انھیں طلاق کا حکم نہیں دیا جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان سے آپ کا نکاح ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر تھا کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی کہ آپ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کرلیا ہے جو آپ کے متبنیٰ زید کی زوجیت میں تھیں اور آپ ہی نے انھیں طلاق کا حکم دیا تھا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی مقدار پر عتاب ہو گیا کہ ایک ایسے امر کے

[1] تفسیر القرطبی ۱۴/ ۱۲۳

سلسلے میں آپ کو لوگوں کا ڈر ہوا جس کو اللہ پاک نے آپ کے لیے مباح قرار دیا ہے کہ آپ نے اَمسک ''طلاق مت دو'' فرمادیا حالاں کہ آپ کو معلوم تھا کہ زید ان سے علاحدگی اختیار کرہی لیں گے اور اللہ پاک نے آپ کو بتلایا کہ ہر حال میں اللہ ہی اس کا سزاوار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ ہمارے علماء رحمہم اللہ نے فرمایا: اس آیت کی تفسیر میں یہ سب سے بہتر قول ہے اور محقق مفسرین وعلماء راسخین مثلاً زہری، قاضی بکر بن علاء قشیری، قاضی ابوبکر بن العربی وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔''

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا۔ (مراد اس سے نکاح ہے حضرت زینبؓ سے درصورت تطلیق زید کے، جس کو حق تعالیٰ نے زوجنا کھا میں قولاً اور خود نکاح واقع کردینے سے فعلاً ظاہر فرمایا)۔ [1]

دلائل عقلیہ سے الزامات کی تردید

(۱) اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں حضرت زینبؓ کی محبت اسی طرح اثرانداز ہوگئی ہوتی جیسا کہ مستشرقین اور مفترین کہتے ہیں، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید کو اللہ سے ڈرنے اور طلاق سے باز رہنے کی تلقین نہ کرتے اور نہ اس کا انتظار کرتے کہ حضرت زید اپنا معاملہ آپ کے پاس لائیں؛ بلکہ اسی وقت جو آپ پر یہ کیفیت طاری ہوئی، حضرت زیدؓ کو خود ہی طلاق کا حکم دیتے۔

(۲) بعض مستشرقین کا الزام ہے کہ صرف حضرت زینبؓ سے نکاح کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہ آیت نعوذ باللہ آپ نے خود گڑھ لی تھی، تو سوال یہ ہے کہ آپ ایسا حکم یا ایسی آیت کیوں وضع کرتے جس میں خود آپ پر عتاب ہے اور آپ کو تنبیہ کی گئی ہے؛ حالاں کہ آپ کو معلوم تھا کہ آپ کے متبعین ہمیشہ اس آیت کی بھی تلاوت کریں گے، اگر آیت آپ کی طرف سے ہوتی تو کم از کم وہ حصہ تو ضرور شامل نہ ہوتا جس میں خود آپ کو فہمائش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے ڈر سے کسی چیز کو چھپائے ہوئے تھے؛

[1] بیان القرآن ۷ / ۸۲ تاج پبلشرز

اس لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتی تھیں:

لو كان النبي صلى الله عليه وسلم كاتمًا شيئًا من الوحي لكتم هذه الآية (وإذ تقول للذي أنعم الله عليه وأنعمت عليه). [۱]

"اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی کسی چیز کو چھپانا ہوتا تو اس آیت **وإذ تقول** الخ کو چھپاتے۔"

گویا ایک ایسی آیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت اور بہ احسن وجوہ اداء امانت کی دلیل ہے، اسی کو مستشرقین نے آپ کی شخصیت پر طعن کا ذریعہ بنالیا ہے۔

(۳) مخالفین نے جن روایات کو بنیاد بنا کر افسانہ سازی کی ہے، ان سب روایات کی تفصیل ایک دوسرے سے کئی صورتوں میں مختلف ہے، کچھ روایات میں مذکور ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تیمارداری کے لیے ان کے گھر تشریف لائے؛ جب کہ دیگر روایات یہ بتاتی ہیں کہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا گھر پر اکیلی تھیں اور ان کا سر ننگا تھا جب کہ دوسری روایات کے مطابق انھوں نے جلدی میں کپڑا لیا؛ جب کہ دوسری میں وہ نعوذ باللہ بالکل کپڑوں کے بغیر تھیں جب کہ دوسری طرف یہ روایات حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بھی بالکل مختلف تفصیل بیان کرتی ہیں جن میں سے کچھ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بیوی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سلوک کی شکایت کرتے ہیں اور کسی میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند کی بنیاد پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کرتے ہیں اور انھیں اس صورت میں اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ ان روایات کا باہمی تضاد ان کو ضعیف ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔" [۲]

(۴) مستشرقین کے افتراء کی پوری عمارت اس بیانیے پر ہے کہ اچانک حضرت زینبؓ پر آپ کی نظر پڑی اور آپ نعوذ باللہ مفتون ہو گئے، تو کیا حضرت زینبؓ رسول اللہ

[۱] سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۳۲۰۸

[۲] وقار اکبر چیمہ، اقرأ، ڈاٹ کام

صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غیر معروف تھیں اور کیا آپ نے اس سے پہلے انھیں نہیں دیکھا تھا کہ اس موقع پر آپ اچانک دیکھ کر بے قابو ہو گئے؟ سب جانتے ہیں اور مستشرقین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ حضرت زینبؓ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قریب کی رشتہ داری تھی، وہ آپ کی پھوپھی امیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی اور آپ کے گھر کی نواسی ہیں۔ وہ آپ کے سامنے پلی بڑھی اور جوان ہوئی ہیں اور قرابت اور ماحول کے اعتبار سے اس سے پہلے بھی نظر پڑتی رہی ہوگی۔ اس لحاظ سے وہ نہ تو آپ کے لیے کوئی نادر خاتون ہیں اور نہ غیر معروف؛ لہٰذا عمر کے اس مرحلے میں نظر پڑتے ہی بے قابو ہو جانے کا الزام بھی محض اتہام اور حقیقت سے بعید تر ہے۔

(۵) اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حسن و جمال فریفتہ کیے ہوئے تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی طرف سے نکاح کا پیغام کیوں نہیں دیا جو بہ آسانی مکمل اعزاز کے ساتھ منظور ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ آپ زینبؓ کا نکاح حضرت زید بن حارثہ سے کر رہے ہیں؛ حالاں کہ خود حضرت زینبؓ ابتداءً اس پر راضی نہیں تھیں اور حضرت زیدؓ کو بھی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔

(۶) اگر اس نکاح کا وہی پس منظر ہوتا جو مستشرقین بہ زعم خود باور کرانا چاہ رہے ہیں، تو کیا منافقین و مخالفین جو ہر وقت ٹوہ میں رہتے تھے، اس کو موضوع بحث نہ بناتے اس لیے کہ اس طرح کی صورت حال معاشرتی اقدار و روایات کے خلاف تو ضرور تھی؛ لیکن ان کی مخالفت کا پورا زور صرف منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح پر ہے کسی اور پہلو پر نہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ یہ بعد کے لوگوں کی ایجاد اور من گھڑت بات ہے۔

(۷) چند سوالات: ہم علی سبیل التنزل مان لیتے ہیں کہ مستشرقین نے مقاتل اور ابن اسحاق کی جس روایت کو لے کر بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے وہ کسی درجے میں صحیح ہے تو بھی اس روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کون سا عمل مستشرقین کے اعتبار سے قابل گرفت ہے اسے بھی واضح کیا جانا چاہیے؟

کیا آپ کا یہ عمل قابل گرفت ہے کہ اچانک آپ کی نظر حضرت زینبؓ پر پڑ گئی اور

آپ نے دل میں میلان محسوس کیا؟ کیا آپ بشر نہیں ہیں؟ اگرچہ عام بشر نہیں، بلکہ افضل البشر ہیں۔

یا آپ کا یہ عمل قابل اعتراض ہے کہ آپ حضرت زینبؓ کے پاس ٹھہرنے اور اندر جانے کے بجائے سبحان اللہ مقلب القلوب کہتے ہوئے واپس لوٹ آئے؟

یا آپ کا یہ عمل لائق مواخذہ ہے کہ آپ نے حضرت زیدؓ کو ادیگی حقوق اور طلاق سے باز رہنے کی تاکید کی۔

یا آپ کا یہ عمل غلط ہے کہ تنگ آکر جب حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے شریعت کے مطابق باضابطہ نکاح ہوا؟

یا آپ کا یہ عمل ناروا ہے کہ آیت پاک کو جس میں آپ پر عتاب کا ذکر ہے، آپ نے من وعن امت کے سامنے پیش کر دیا؟

اگر ان میں سے کوئی عمل غلط نہیں اور واقعی نہیں ہے تو اس سے یقیناً مستشرقین کا سفسطہ اور خبث باطن خوب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

بعض مستشرقین کا اعتراف حقیقت

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کے مسئلے میں اکثر مستشرقین نے طعن والزام کی ہی راہ اختیار کی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اور اس کو کارل بردکلمان، جرجی زیدان اور بعض دوسرے معاصر عرب قلم کاروں نے خوب ہوا دینے کی کوشش کی ہے؛ لیکن حیرت انگیز طور پر مشہور مستشرق منٹگری واٹ نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور تمام مستشرقین ومخالفین کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ اس نے اپنی کتاب "محمد فی المدینۃ" میں لکھا ہے:

أخذوا ينمقون القصص حول علاقاته بالنساء أو حبه من النظرة الأولى لزينب." [1]

"یہ لوگ عورتوں کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلقات یا پہلی ہی نگاہ میں

---

[1] محمد فی المدینۃ، ص ۵۰۲

زینبؓ کی محبت میں گرفتار ہونے کے تعلق سے افسانے گڑھنے لگے ہیں۔"

اس کے بعد منٹگمری واٹ نے اپنی دانست اور تجزیے کے اعتبار سے اس نکاح کے چار اسباب بیان کیے ہیں:

پہلا سبب یہ تھا کہ اس کے ذریعے عرب کی ایک قدیم روایت اور غلط رواج کا خاتمہ کر دیا جائے اور واضح کر دیا جائے کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اس کی مطلقہ سے نکاح درست ہے اور قرآن سے اشارہ ملتا ہے کہ ابتدا میں محمد رائے عامہ کی ناپسندیدگی کے اندیشے سے زینب سے نکاح نہیں کرنا چاہتے تھے پھر انھیں معلوم ہوا کہ یہ نکاح ضروری ہے۔ اللہ پاک نے طے کر دیا ہے۔ (محمد فی المدینہ، ص ۵۰۲)

دوسرا سبب یہ تھا کہ زینبؓ بنت جحش کا تعلق مکہ کے قبیلۂ عبد شمس سے تھا، جس کی اپنی ایک حیثیت تھی، اس نکاح کا مقصد اس قبیلے کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم کرنا بھی تھا۔ [۱]

تیسرا سبب یہ ذکر کیا ہے کہ اس نکاح کا سیاسی مقصد بھی تھا کہ زینبؓ کا قبیلہ ابوسفیان کے والد کا حلیف تھا اور ابوسفیان کی بیٹی سے نکاح سے قبل ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تھا۔ اور ابوسفیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک بڑی فوجی مہم کی قیادت کر رہے تھے۔ (تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تھا کہ زینب سے نکاح کر کے کسی حد تک ابوسفیان کی عداوت کم کی جائے) [۲]

چوتھا سبب یہ بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا احساس تھا کہ زینبؓ حضرت زیدؓ سے ملول خاطر ہو گئی ہیں اور اب آپ ہی اس لائق ہیں کہ ان سے نکاح کر کے ان کی اشک شوئی کریں۔ [۳]

منٹگمری واٹ نے اپنی بحث کو اس مدلل تجزیے پر ختم کیا ہے:

وبالرغم من القصص العاطفية، من البعيد أن يكون محمد قد أُسر

---

[۱] محمد فی المدینہ، ص ۴۳۰
[۲] محمد فی المدینہ، ص ۵۰۴
[۳] محمد فی المدینہ، ص ۵۰۵

بمفاتن زينب الجسدية..... ولكن زينب حين تزوجت محمدًا كانت في الخامسة والثلاثين من عمرها وهي سن متقدمة بالنسبة للعربية. [1]

"جذباتی کہانیوں کے باوجود یہ دور کی کوڑی ہے کہ محمدؐ، زینبؓ کی جسمانی کشش پر مفتون ہوگئے تھے۔ زینب کا جس وقت محمدؐ سے نکاح ہوا ہے وہ ۳۵ سال کی تھیں اور یہ عربی خاتون کے اعتبار سے بڑھی ہوئی عمر ہے۔"

●●●

[1] محمد فی المدینۃ، منتجري واط، ترجمہ: شعبان برکات، ص ۵۰۵-۵۰۶

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے
کم سنی کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح

ام المومنین صدیقۂ کائنات، حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما وارضاہما، ان پاکباز اور ستودہ صفات خواتین میں سے ہیں، جنہوں نے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے مالامال ہو کر علم وفضل اور معرفت ودانش مندی کے وہ گہر لٹائے ہیں جن کی ہمسری دنیا کی کوئی خاتون نہیں کرسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں باضابطہ آیات نازل فرما کر آپ کے ذکر کو خلود عطا کردیا اور آپ کی عفت کے ایقان کو جزء ایمان بنادیا، زہد وورع اور دنیا سے بے رغبتی میں بھی اپنی مثال آپ تھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ پاک نے جس طرح سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوت ورسالت کے لیے انتخاب فرمایا تھا، اسی طرح آپ کی زوجیت ومصاحبت کے لیے بھی اعلیٰ صفات کی حامل ازواج مطہرات کو منتخب فرمالیا تھا؛ جن میں گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک خاص مقام اور امتیاز حاصل ہے۔

تعارف

آپ ام المومنین ام عبداللہ، عائشہ بنت ابی بکر صدیق، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ اور امت کی سب سے بڑی خاتون فقیہہ ہیں، آپ کی والدہ: ام رومان بنت عامر ہیں، آپ نے براہِ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کا ایک بڑا ذخیرہ نقل کیا، اپنے والد ابوبکر نیز عمر، فاطمہ، سعد، حمزہ بن عمرو اسلمی اور جذامہ بنت وہب سے آپ نے حدیث

روایت کی ہے۔ [۱]

علم وفضل اور حدیث وفقہ میں امتیاز

ابن شہاب زہری فرماتے ہیں:

"لو جمع علم عائشة إلى علم جميع النساء، لكان علم عائشة أفضل" [۲]

''حضرت عائشہ کے علم کا جملہ خواتین کے علم سے تقابل کیا جائے تو عائشہؓ کا علم سب سے بڑھا ہوگا''۔

اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور سرعتِ حفظ کی دولت سے نوازا تھا، ابن کثیر فرماتے ہیں:

"لم يكن في الأمم مثل عائشة في حفظها وعلمها وفصاحتها وعقلها". [۳]

''علم وحفظ اور فصاحت وذکاوت میں، اقوام عالم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نظیر نہیں ملتی ہے۔''

عروہ بن زبیر کہتے ہیں:

"ما رأيت أحدا أعلم بفقه ولا بطب ولا بشعر من عائشة رضى الله عنها". [۴]

''میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ فقہ، طب یا شاعری کا علم رکھتا ہو۔''

حافظ ذہبی کہتے ہیں:

"أفقه نساء الأمة على الاطلاق، ولا أعلم في أمة محمد؛ بل ولا في

---

[۱] سیر اعلام النبلاء ۲/۱۴۱

[۲] سیر اعلام النبلاء ۲/۱۴۱

[۳] البدایہ والنہایہ ۴/۳۲۲

[۴] الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب ۴/۴۳

النساء مطلقًا امرأةً أعلم منها" [۱]

(امت کی خواتین میں بلاکسی استثناء کے سب سے بڑی فقیہہ ہیں اور اس امت؛
بلکہ دنیا جہاں کی خواتین میں مجھے ایسی خاتون نظر نہیں آتی جو علم وفضل میں آپ سے
بڑھی ہوئی ہو)۔

آپ نے جو احادیث روایت کی ہیں، ان کی تعداد حافظ ذہبی کے بہ قول دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہے، جن میں سے ایک سو ستر احادیث کی تخریج امام بخاری و مسلم نے مشترکہ طور پر کررکھی ہے، جب کہ ۵۴ میں بخاری اور انہتر میں مسلم منفرد ہیں [۲] اس حساب سے بخاری میں آپ کی دو سو اٹھائیس اور مسلم میں دو سو بتیس روایتیں ہیں۔

زہد وعبادت

حضرت عائشہؓ کو عبادت سے بھی بڑا شغف تھا، اس کثرت سے روزے رکھتی تھیں کہ آپ پر ضعف طاری ہو گیا تھا، زہد اور دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عروہ کے بہ قول ایک بار آپ نے ستر ہزار دراہم صدقہ کر دیئے؛ حالاں کہ آپ کے کپڑے پر پیوند لگے ہوئے تھے۔ ام ذرہ کہتی ہیں: ''عبداللہ بن زبیر نے حضرت عائشہ کے پاس دو تھیلوں میں تقریباً ایک لاکھ دراہم بھیجے؛ لیکن شام ہوتے ہوتے اس طرح انھیں تقسیم کر دیا کہ ایک درہم بھی نہیں بچ سکا کہ جس سے اس دن کے افطار کا نظم ہو پاتا''۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قسمت کا ستارہ اس وقت اوج ثریا پر پہنچ گیا جب وہ دنیا کے سب سے پاکباز انسان، محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہوئیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، بہ وقت نکاح آپ کی عمر پچیس اور حضرت خدیجہ کی چالیس برس تھی، حضرت خدیجہؓ نہایت غم گسار اور اطاعت شعار بیوی تھیں، ہجرت سے تین سال قبل نبوت کے دسویں سال حضرت

---

[۱] سیر أعلام النبلاء ۲/ ۱۳۵

[۲] سیر أعلام النبلاء ۲/ ۱۳۹

خدیجہ کی وفات سے آپ کو بڑا رنج ہوا، جاںنثار صحابہ نے اس کیفیت کو محسوس کر کے آپ کو نکاحِ ثانی کا مشورہ دیا؛ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ کے پاس آکر عرض کیا کہ آپ دوسرا نکاح کرلیں، آپ نے فرمایا: کس سے؟ خولہ نے کہا: بیوہ اور کنواری دونوں طرح کی لڑکیاں موجود ہیں، جس کو پسند فرمائیں اس کے متعلق گفتگو کی جائے، فرمایا: وہ کون ہیں؟ خولہ رضی اللہ عنہا نے کہا: بیوہ تو سودہ بنت زمعہ ہیں اور کنواری ابوبکر کی لڑکی عائشہ، ارشاد ہوا: بہتر ہے تم اس کی نسبت گفتگو کرو۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئیں اور ان سے تذکرہ کیا۔ جاہلیت کا دستور تھا کہ جس طرح سگے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز نہیں، عرب اپنے منہ بولے بھائیوں کی اولاد سے بھی شادی نہیں کرتے تھے، اس بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: عائشہ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی ہے، آپ سے نکاح کیوں کر ہوسکتا ہے؟ حضرت خولہ نے آکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا، آپ نے فرمایا: ابوبکر میرے دینی بھائی ہیں اور اس قسم کے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے قبول کرلیا۔

لیکن اس سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہوچکی تھیں؛ اس لیے ان سے بھی پوچھنا ضروری تھا، حضرت ابوبکر نے جبیر سے جاکر پوچھا کہ تم نے عائشہ کی نسبت اپنے بیٹے سے کی تھی، اب کیا کہتے ہو؟ جبیر نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ جبیر کا خاندان ابھی اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا، اس کی بیوی نے کہا: اگر یہ لڑکی ہمارے گھر آگئی تو ہمارا بچہ بد دین ہوجائے گا ہم کو یہ بات منظور نہیں۔ [1]

حدیثوں میں آیا ہے کہ نکاح سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے سامنے کوئی چیز پیش کررہا ہے، پوچھا کیا ہے؟ جواب دیا کہ آپ کی بیوی ہیں۔ آپ نے کھول کر دیکھا تو حضرت عائشہ رضی

[1] مسند احمد، ۲۱۱/۶، سیرت عائشہ ص ۲۴

اللہ عنہا تھیں۔

عن عائشة قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: أریتک في المنام مرتین، إذا رجل یحملک في سرقة من حریر، فیقول: هذه امرأتک، فاکشفها، فإذا هي أنتِ، فأقول: إن یکن هذا من عند اللہ یمضه. [1]

بہ وقت نکاح اور رخصتی حضرت عائشہ کی عمر

مشہور اور محقق قول یہی ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر چھ سال اور بہ وقت رخصتی نو سال تھی۔ [2]

اگر چہ بعض حضرات نے اس قول کی تغلیط کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بہ وقت نکاح سولہ سال اور بہ وقت رخصتی اٹھارہ سال کی تھیں، ہمارے دیار میں اس قول کے قائلین میں سرفہرست مولانا محمد علی اور مولانا حبیب الرحمن کاندھلوی صاحبان ہیں، مؤخر الذکر کا اس موضوع پر "تحقیق عمر صدیقۂ کائنات" کے نام سے مستقل رسالہ ہے؛ لیکن یہ قول غیر محقق اور ناقابل اعتناء ہے: اس کی متعدد وجوہ ہیں

(۱) صحیحین کی احادیث اس بات پر متفق ہیں کہ بہ وقت رخصتی حضرت عائشہ نو سال کی تھیں۔

(۲) حضرت عائشہؓ نے خود ہی اپنی شادی کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"زفت إلیه وهی بنت تسع سنین ولعبها معها، ومات عنها وهی بنت ثمان عشرة" [3]

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تو وہ سات سال کی لڑکی تھیں، اور ان سے زفاف کیا گیا تو وہ نو سال کی تھیں اور ان کے کھلونے ان کے ساتھ تھے، اور جب

---

[1] صحیح بخاری: ۳۸۹۵

[2] بخاری، باب تزویج النبی عائشۃ وقدومہا المدینۃ وبنائہ بہا، ۳۸۹۴

[3] صحیح مسلم، حدیث: ۳۴۸۱

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔"

اور ظاہر ہے کہ خود صاحب واقعہ کی تصریح کو محض کمزور بنیادوں پر رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور حضرت عائشہ جیسی قوت حفظ وفہم میں ممتاز راویہ کا خود اپنی عمر کے متعلق ایسی غلطی ہونا کہ اپنی گیارہ برس کی عمر کو چھ برس کی اور سولہ برس کی عمر کو نو برس کی اور اپنی پچیس برس کی بیوگی کو اٹھارہ برس کی عمر کی بیوگی کہہ دیں، عجوبہ روزگار ہے۔

(۳) جو حضرات اٹھارہ سال کے قائل ہیں ان کے بہ قول حضرت عائشہ کی پیدائش چار سال قبل بعثت ہوئی ہے؛ حالاں کہ یہ قول محققین کی تصریح کے بالکل خلاف ہے؛ چنانچہ ذہبی کہتے ہیں: "عائشة ممن ولدت في الإسلام" اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "وولدت - يعني عائشة - بعد المبعث بأربع سنين أو خمس سنين" [۱]

(۴) کتب سیرت میں وضاحت ہے کہ حضرت عائشہ کا انتقال ۵۷ھ میں بہ عمر تریسٹھ سال ہوا ہے اور یہ اس وقت درست ہوگا جب کہ بہ وقت ہجرت حضرت عائشہ کی عمر ۸ سال تسلیم کی جائے۔

(۵) اس حدیث کے راوی ہشام پر طعن کرنے کے بجائے مسئلے پر اس پہلو سے غور کریں کہ حضرت عائشہ جس وقت رخصت ہو کر میکے لائی جاتی ہیں تو وہ جھولے پر سے اور کھیل سے اٹھا کر لائی جاتی ہیں، ان کی ماں ان کا منہ دھوتی ہیں، بال برابر کر دیتی ہیں، چھوٹی سہیلیاں ساتھ ہوتی ہیں، یہاں آکر بھی گڑیوں کے کھیلنے کا شوق باقی رہتا ہے اور تمام واقعات احادیث میں بالتفصیل مذکور ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ ایک نو برس کی کم سن لڑکی کا حلیہ ہے یا سولہ برس کی پوری جوان عورت کا؟ [۲]

بہ ہر حال دلائل سے یہ بات متحقق ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال اور بہ وقت رخصتی ۹ سال تھی۔

---

[۱] الاصابة

[۲] دیکھو: مسند طیالسی، ص ۲۰۵، اور دارمی، ص ۲۹۲، سیرت عائشہ، ص ۳۱۹

مستشرقین کا اعتراض

اس پر مستشرقین اور متجددین کو سخت اعتراض ہے کہ ایک نو سالہ لڑکی کیسے کسی مرد کے قابل ہو سکتی ہے؟ اور وہ بھی جن کی عمر پچاس سے متجاوز ہو؟

نکاح بہ امر الٰہی تھا

اس کا سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ یہ نکاح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ امر الٰہی فرمایا تھا جیسا کہ روایت میں تصریح گزر چکی ہے کہ خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نکاح کی بابت بتلا دیا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا تھا:

"إن يكن من عند الله يمضه"

"اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اللہ خود ہی اسے انجام تک پہنچائے گا۔"

لیکن ظاہر ہے کہ آج کی مادہ پرست، دین بیزار دنیا کو اس جواب سے قناعت اور تسلی نہیں ہو سکتی، تو آیئے ہم اس کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں:

اس عمر میں نکاح کا رواج تھا

دراصل نکاح ایک معاشرتی عمل ہے؛ بلکہ معاشرتی ضرورت ہے؛ اس لیے نکاح میں ہر جگہ کے معاشرے، وہاں کی تہذیب اور عرف وعادت کو بڑا دخل ہوتا ہے، اس تناظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عائشہ جس معاشرے کا حصہ ہیں، اس میں کم سنی میں نکاح قطعاً معیوب نہیں؛ بلکہ متعارف اور رائج ہے؛ چنانچہ:

(۱) حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نومولود لڑکی سے اسی دن نکاح پڑھا دیا جس دن وہ پیدا ہوئی۔ [۱]

(۲) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے کم سن لڑکے سلمہ کا نکاح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نابالغ لڑکی سے کیا تھا۔ [۲] بلکہ ترکمانی فرماتے ہیں:

---

[۱] مرقاۃ ۳/ ۴۱۷ [۲] احکام القرآن رازی، ج ۲، ص ۵۵

"وزوج غير واحد من الصحابة ابنته الصغيرة". [۱]

بلکہ نو، دس سال کی عمر اس زمانے اور اس معاشرے میں وہ عمر تھی جس میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو سکتے تھے؛ چنانچہ بخاری شریف میں حسن ابن صالح کا قول نقل کیا گیا ہے:

"أدركت جارةً لنا جدةً بنت احدى وعشرين سنة" [۲]

(ہمارے پڑوس میں ایک خاتون تھیں جو اکیس سال کی عمر میں دادی بن گئی تھیں)

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس جدہ کا نکاح صغرسنی میں ہوا تھا اور صرف دس سال کی عمر میں اس نے بچہ جنا تھا اور یہی صورت حال اس کی بیٹی کی بھی رہی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھی ایک خاتون کو دیکھا ہے جو نو سال کی عمر میں بالغ ہوگئی تھی اور دس سال کی عمر میں اس کے یہاں بیٹی کا تولد ہوا۔ [۳] اس لیے فقہاء نے بھی رخصتی اور زفاف کے لیے کسی خاص عمر کی تحدید نہیں کی ہے؛ بلکہ اس کا مدار اس کی طاقت اور جسمانی ساخت پر ہے؛ چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"أكثر المشائخ على أنه لا عبرة للسن في هذا الباب، وإنما العبرة للطاقة إن كانت ضخمة سمينة تُطيق الرجال ولا يخاف عليها المرض من ذلك، كان للزوج أن يدخل بها وإن لم تبلغ تسع سنين" [۴]

(اکثر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ اس باب (صغیرہ سے جماع) میں عمر کا کوئی اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ اعتبار طاقت وقوت کا ہے، اگر بھاری بھرکم اور موٹی ہو مردوں کو برداشت کر لیتی ہو اور اس کے سبب مرض کا اندیشہ نہ ہو تو شوہر دخول کر سکتا ہے اگرچہ وہ نو سال کی بھی نہ ہو)۔

---

[۱] ترکمانی علی البیہقی، ج ۱، ص ۷۶-۷۹

[۲] باب بلوغ الصبیان وشہادتہم، کتاب الشہادات

[۳] دیکھیے فتح الباری، ج ۵، ص ۳۱۲

[۴] الفتاویٰ الهندية

اور خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں بھی یہ اہم حقیقت ملحوظ ہے؛ چنانچہ ان کا عقد اگرچہ چھ سال کی عمر میں ہوگیا تھا؛ لیکن رخصتی کے لیے مزید تین سال انتظار کیا گیا اور اس دوران ان کی والدہ اِس کا خاص خیال رکھتی تھیں اور مختلف غذاؤں کے ذریعے اس کی تدبیر کرتی تھیں کہ جسم کسی قدر فربہ ہوجائے، چنانچہ حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں:

"كانت امي تعالجني للسمنة تريد ان تدخلني على رسول الله صلى الله عليه وسلم، فما استقام لها ذلك، حتى اكلت القثاء بالرطب فسمنت كاحسن سمنة." [1]

"ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میری ماں میرے موٹا ہونے کا علاج کرتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ وہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کرسکیں، لیکن کوئی تدبیر بن نہیں پڑی، یہاں تک کہ میں نے ککڑی کھجور کے ساتھ ملا کر کھائی، تو میں اچھی طرح موٹی ہوگئی۔"

اس لیے اس عرب معاشرے کو ہمارے اس معاشرے پر قیاس کرنا فضول ہے جس میں کمسن لڑکیوں سے نکاح معاشرتی جرم سمجھا جاتا ہے۔

عرب معاشرے میں آج بھی یہ قابل قبول ہے

بلکہ آج بھی عرب معاشرہ اس کو قبول کیے ہوئے ہے؛ چنانچہ العربیۃ نیٹ نے یکم نومبر ۲۰۱۰ء کو ایک رپورٹ شائع کی تھی جس کا عنوان ہی تھا: "صغيرات يفضلن كبار السن والمتزوجين" (کم عمر لڑکیاں معمر اور شادی شدہ مردوں کو ترجیح دے رہی ہیں) اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ذہنی سکون اور مالی منفعت کی خاطر بہت سی عرب لڑکیاں کبیر السن مردوں کو ترجیح دیتی ہیں، مثال کے طور پر ایک سولہ سالہ طالبہ کہہ رہی ہے کہ اسے اس پر اطمینان اور مسرت ہے کہ اس کا نکاح ایک چھیاسٹھ سالہ مرد سے ہونے جارہا ہے، ۲۰ سالہ "حفان" کا کہنا ہے کہ اس کی پانچ بہنیں ہیں اور پانچوں کا نکاح شادی شدہ

---

[1] سنن ابن ماجہ: ۳۳۲۴ باب القثاء والرطب یجمعان

مردوں سے ہوا ہے اور وہ پانچوں آسودگی اور عافیت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ [1]

اس لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ نکاح چوں کہ ایک معاشرتی عمل ہے؛ اس لیے اس کے مختلف پہلوؤں میں اس سماج و معاشرہ کے عرف و رواج کا خاص خیال رکھا جائے۔

چنانچہ روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ سے نکاح کا مشورہ سب سے پہلے ایک قریشی خاتون حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا، اگر کمسنی کا نکاح معاشرتی اعتبار سے معیوب ہوتا تو یقیناً وہ خاتون کبھی نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مشورہ دیتیں اور نہ ہی حضرت عائشہ کی والدہ ام رومان کبھی اس کے لیے آمادہ ہوتیں اور کفار مخالفین کو بھی ایک موقع ہاتھ آجاتا اور آپ کی شخصیت کو داغدار کرنے اور آپ کے خلاف پروپیگنڈے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے؛ لیکن سب کو معلوم ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا؛ بلکہ حضرت عائشہؓ اس سے پہلے ہی جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں، بیٹے کی ماں کی طرف سے رشتے کا انکار کیے جانے کے بعد ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ منظور کیا تھا۔

گرم آب وہوا

دوسری اہم بات یہ ہے کہ کمسنی کے نکاح کو معاشرتی طور پر قبول عام حاصل ہونے میں وہاں کی گرم آب وہوا کو بھی بڑا دخل ہے، جس کے نتیجہ میں لڑکیاں جلد مردوں کے قابل ہو جایا کرتی ہیں، خاص کر ایسی لڑکیاں جن میں ذہنی نشو ونما کی صلاحیت ہوتی ہے قامت اور جسم کے اعتبار سے بھی وہ جلد بڑھتی ہیں۔ حضرت علامہ سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

"اس کم سنی کی شادی کا اصل منشاء نبوت اور خلافت کے درمیان تعلقات کی مضبوطی تھی، ایک تو خود عرب کی آب وہوا میں عورتوں کی غیر معمولی نشو نما کی طبعی صلاحیت موجود ہے، دوسرے عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح ممتاز اشخاص کے دماغی اور ذہنی قوی میں ترقی کی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح قد و قامت میں بھی بالیدگی کی خاص قابلیت ہوتی ہے، بہر حال اس کم سنی میں آنحضرت صلی

[1] دیکھیے العربیہ ڈاٹ نیٹ

اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا، اس بات کی صریح دلیل ہے کہ لڑکپن ہی سے ان میں نشو ونما، ذکاوت، جودت ذہن اور نکتہ رسی کے آثار نمایاں تھے۔" [1]

حضرت عائشہ کا تأثر

اس مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس نکاح کو کس نگاہ سے دیکھتی ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کبھی اس نکاح پر ناگواری کا اظہار نہیں کیا، ناگواری کا اظہار تو کجا، وہ اس کو اپنی بہت بڑی خوش بختی سمجھتی تھیں، ان کا ایقان تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت بیوی ہیں اور کیوں نہ ہو جب کہ شوہر دنیا کے سب سے بہترین انسان، رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ملے تھے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اس شادی کو انتہائی مبارک خیال کرتی تھیں اور آپ کی شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی؛ اس لیے آپ شوال ہی کے مہینہ میں اس قسم کی تقریبوں کو پسند کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ "میری شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی اور باایں ہمہ شوہر کے حضور میں مجھ سے خوش قسمت کون تھیں"

عن عروة، عن عائشة، قالت: "تزوجني رسول الله صلى الله عليه وسلم في شوال، وأدخلت عليه في شوال"، - وكانت عائشة تحب أن تدخل نساءها في شوال- "فأي نسائه كانت أحظى عنده مني؟"

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے شوال میں شادی کی، اور میری رخصتی بھی شوال کے مہینے میں ہوئی۔ (عروہ کہتے ہیں) عائشہ رضی اللہ عنہا پسند کرتی تھیں کہ وہ قریبی خواتین کی رخصتی شوال میں کریں، (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں سے مجھ سے زیادہ آپ سے نزدیک اور فائدہ اٹھانے والی دوسری بیوی کون تھیں!! [2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری اور آپ کی مسرت کے حصول میں شب

---

[1] سیرت عائشہ ص ۲۵

[2] صحیح مسلم/ النکاح 11(1423)

دروز کوشاں رہتیں، اگر ذرا بھی آپ کے چہرے پر حزن وملال کا اثر نظر آتا، بے قرار ہوجاتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کا اتنا خیال تھا کہ ان کی کوئی بات ٹالتی نہ تھیں، ایک دفعہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے خفا ہوکر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھی تھیں؛ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیالی لوگوں نے سفارش کی تو انکار کرتے نہ بنا، آپ کے دوستوں کی بھی اتنی ہی عزت کرتی تھیں اور ان کی کوئی بات بھی رد نہیں کرتی تھیں۔

علم کی اشاعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی میں نکاح کی متعدد مصلحتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نصف حصہ جو عام نگاہوں سے اوجھل تھا وہ امت کے سامنے آگیا اور علم ومعرفت کے اعتبار سے مسلمانوں کو زبردست نفع پہنچا۔

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ’’عرب میں خود مردوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا تو عورتوں میں کیا ہوتا، جب اسلام آیا تو قریش کے سارے قبیلہ میں صرف سترہ آدمی لکھ پڑھ سکتے تھے، ان میں شفاء بنت عبداللہ عدویہ صرف ایک عورت تھیں، اسلام کی دنیوی برکتوں میں یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ نوشت وخواند کا فن بھی فروغ پاتا جاتا تھا، بدر کے قیدیوں میں جو نادار تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں، صفہ میں کم وبیش سو اصحاب داخل تھے ان کو دیگر تعلیمات کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔
>
> ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہ نے خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ فن شفاء بنت عبداللہ عدویہ سے سیکھا تھا بعض اور صحابیات بھی نوشت وخواند سے آشنا تھیں۔
>
> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج اور خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس کم سنی کی شادی میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی فیضان صحبت نے سیکڑوں مردوں کو سعادت کے درجۂ اعلیٰ پر پہنچادیا تھا؛

لیکن فطرۃً یہ موقع عام عورتوں کو میسر نہیں آسکتا تھا، صرف ازواج مطہرات اس فیض سے متمتع ہوسکتی تھیں اور پھر یہ نور آہستہ آہستہ انھیں ستاروں کے ذریعے سے پوری کائنات نسوانی میں پھیل سکتا تھا۔

حضرت عائشہ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات بیوہ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں داخل ہوئی تھیں، اس بناپر ان میں حضرت عائشہ ہی خالص فیضان نبوت سے مستفیض تھیں، لڑکپن کا زمانہ جو عین تعلیم وتربیت کا زمانہ ہے، ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ کاشانۂ نبوت میں پہنچادی گئیں کہ ان کی ذات اقدس، پُرنور اور کامل بن کر دنیا کی نصف آبادی کے لیے شمع راہ بن جائے۔ [1]

چنانچہ علمی حیثیت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف امہات المومنین پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوں پر؛ بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہ رضی اللہ علیہم پر فوقیت عام حاصل تھی، صحیح ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"ما أشكل علينا أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم حديث قط فسألنا عائشة إلا وجدنا عندها منه علما."

(ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی نہیں پیش آئی کہ جس کو ہم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ اہم معلومات ہم کو نہ ملی ہوں)

عطا بن ابی الرباح تابعی رحمۃ اللہ علیہ جن کو متعدد صحابہ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، کہتے ہیں:

"كانت عائشة أفقه الناس وأعلم الناس وأحسن رأيا في العامة"

(حضرت عائشہ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں)۔

حفظ حدیث اور سنن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت کا فرض گو دیگر ازواج مطہرات

---

[1] سیرت عائشہ ص ۳۱

بھی ادا کرتی تھیں؛ تاہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رتبہ کو ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچی، محمود بن لبید کا بیان ہے کہ ازواج مطہرات، بہت سی حدیثیں زبانی یاد رکھا کرتی تھیں؛ لیکن حضرت عائشہ اور ام سلمہ کے برابر نہیں، امام زہری کی شہادت ہے:

"لو جمع علم الناس کلھم وعلم أزواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکانت عائشة أوسعھم علما."

(اگر تمام مردوں کا اور امہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جاتا، تو حضرت عائشہ کا علم ان میں سب سے وسیع ہوتا)

بعض محدثین نے حضرت عائشہؓ کے فضائل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خذوا شطر دینکم عن حمیراء"

(اپنے مذہب کا ایک حصہ حُمیراء سے سیکھو)

اس حدیث کو ابن اثیر "نہایہ" میں اور فردوس اپنی مسند میں (بتغیر الفاظ) لائے ہیں؛ لیکن لفظاً اس کی سند ثابت نہیں اور اس کا شمار موضوعات میں ہے؛ تاہم معناً اس کے صحیح ہونے میں کس کو شک ہے؟ (سیرت عائشہ ص ۱۴۷)

کم سنی میں نکاح مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس نکاح کے متعلق سب سے زیادہ شکوک وشبہات مستشرقین اور عالم نصرانیت نے پیدا کیے ہیں؛ حالاں کہ اگر ہم نصرانیت کی اندرون خانہ تلاشی لیں تو یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ خود مسیحی مصادر میں کم سنی کے نکاح کا جواز اور تذکرہ موجود ہے، مثلاً انسائیکلو پیڈیا آف کیتھولوجیک کے مطابق حضرت مریم کا نکاح جس وقت یوسف نجار سے ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال اور یوسف نجار کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی) [1]

---

[1] دیکھے (www.newadvent.org)

ظاہر ہے یہ محض افسانہ ہے جس کا ہمارے نقطۂ نظر کے اعتبار سے حقائق سے کوئی واسطہ نہیں؛ لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ عیسائی چرچ اس کم سنی کو زوجین کی عمر میں اس قدر واضح فرق کے باوجود نکاح کے مناسب خیال کر رہا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عمر کی شادی اس وقت کی ثقافت تھی جو صرف عربوں میں نہیں؛ بلکہ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔

اسی طرح یہودی، بڑی تعداد میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے، وہ بھی آپ پر لعن طعن کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے؛ لیکن کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نکاح پر یہودیوں نے کبھی بھی تنقید کی ہو، یہ صاف اور صریح دلیل ہے کہ اس طرح کا نکاح اس وقت کے یہودی معاشرے میں بھی قابل قبول تھا۔

یورپی معاشرے میں کم سنی کے نکاح کا تصور

اسی طرح واشنگٹن پوسٹ میں سارہ بوڈمین کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ مان رہی ہیں کہ اس دور میں بھی مغربی دنیا میں نو سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔

بی بی سی کی سائٹ پر ایک رپورٹ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسپین سے تعلق رکھنے والی ایک کم سن بچی نے اپنا پہلا بچہ محض دس سال کی عمر میں جنم دیا ہے اور اس کا خاندان اس پر بے انتہا مسرور ہے؛ بلکہ اس کی دادی کو بلا وجہ اس واقعہ کو میڈیا میں اہمیت دیے جانے پر سخت تعجب ہے؛ کیوں کہ اس معاشرہ کے لیے عام سی بات ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ عقلاً یا عرفاً کسی بھی طرح یہ نکاح ایسا نہیں ہے کہ جس پر واویلا مچایا جائے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شریعت کم سنی میں نکاح کی دعوت دے رہی ہے؛ بلکہ ہماری گفتگو کا حاصل ہے کہ اگر خاص مصالح کے پیش نظر طرفین کی رضامندی سے اس طرح کے نکاح کی نوبت آتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] دیکھیے: واشنگٹن پوسٹ، ۱۰ رمئی ۲۰۰۶ء

خلاصہ یہ ہوا:

(۱) بہ وقت رخصتی حضرت عائشہؓ کی عمر کے سلسلے میں دو روایتیں ہیں: لیکن اٹھارہ سال والا قول روایت اور درایت دونوں اعتبار سے غلط ہے اور نو سال کی عمر والا قول ہی صحیح اور معتبر ہے، محض اس بنا پر اس قول کی تغلیط درست نہیں ہے کہ اسے ماننے کی صورت میں معاندین کا اشکال لازم آتا ہے؛ اس لیے کہ اس عمر میں نکاح پر کسی قسم کی معذرت یا اظہار ندامت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سے پہلے جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں اور ایک خاتون یعنی حضرت خولہ بنت حکیم نے سب سے پہلے آپ کو اس نکاح کا مشورہ دیا تھا، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس وقت کے معاشرے میں زواج کے لیے یہ معروف طبعی عمر تھی اور اس عمر میں نکاح کو معیوب بالکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

(۳) عرب کا معاشرہ ایسا ہے کہ جس میں گرم آب و ہوا کی وجہ سے نشو و نما جس تیزی سے ہوتی ہے؛ وہ ہمارے یا کسی اور معاشرے سے بہت حد تک مختلف ہے۔

(۴) بعض مغربی ممالک میں اس عمر میں جنسی تعلقات قائم ہو کر توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بعض عرب معاشرے میں شادی شدہ، کبیر السن شوہروں سے نکاح کو افضل خیال کیا جاتا ہے۔

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی میں نکاح سے متعدد دینی تعلیمی اور تربیتی مصلحتیں وابستہ تھیں اور علم نبوت کا ایک اہم حصہ ان کے ذریعے امت تک پہنچ سکا۔

(۶) مسیحیت کے بنیادی ماخذ میں یہ مذکور ہے کہ حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار سے اس وقت ہوا تھا جب کہ وہ بارہ سال کی اور یوسف نجار نوے سال سے زیادہ کی عمر کے تھے، نیز یہود مدینہ جو لعن طعن کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے، انھوں نے بھی کبھی اس حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر انگلی نہیں اٹھائی، جو اس امر کی صریح دلیل ہے کہ عیسائی اور یہودی معاشرے میں بھی یہ قابل قبول عمل تھا۔

(۷) آخری بات یہ ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس نکاح سے حد

درجہ مطمئن ہیں، زوجین میں ایسی ہم آہنگی اور مثالی محبت ہے جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، ایسا ہرگز نہیں کہ کبھی بھی ان کے کسی عمل سے اس نکاح پر ناراضگی یا خفگی محسوس ہوئی ہو؛ بلکہ وہ تو اپنی خوش قسمتی پر حد درجہ نازاں تھیں؛ حالاں کہ ایک موقع ایسا بھی آیا جب انھیں خود خالق کائنات کی طرف سے اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو وہ اس نکاح میں ہی رہیں اور اگر چاہیں تو طلاق لے لیں، دنیا کی بہاریں ان کی منتظر ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدائی فرمان کو پیش کرنے سے پہلے احتیاطاً یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم جواب دینے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کر لینا؛ لیکن انھوں نے فوراً کہہ دیا: کیا میں آپ کے سلسلے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی؟ مجھے اللہ اور اس کے رسول ہی پسند ہیں۔

تو محبت واعتماد کی مضبوط بنیادوں پر قائم ایسے پاکیزہ نکاح کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا اور طعن وتنقید کا نشانہ بنانا، حق وانصاف کا گلا گھونٹنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اللہ پاک ہم سب کو فہمِ صحیح عطا کریں اور صراطِ مستقیم پر گامزن رکھیں؛ آمین،

وصلی اللہ علی النبیِ الکریم محمدٍ و آلہٖ و صحبہٖ أجمعین۔

□□□